اکادمی ادبیات پاکستان
پاکستانی ادب کے معمار
میاں محمد بخشؒ : شخصیت اور فن
حمید اللہ شاہ ہاشمی
PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

پاکستانی ادب کے معمار

میاں محمد بخشؒ
شخصیت اور فن

حمید اللہ شاہ ہاشمی

اکادمی ادبیات پاکستان

نگرانِ اعلیٰ	افتخار عارف
منتظم	محمد انور خان
تدوین و طباعت	سعیدہ درانی
سکیچ	احمد حبیب
اشاعت	2007
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	پوسٹ آفس فاؤنڈیشن پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد : 165/- روپے
	پیپر بیک : 155/- روپے

ISBN: 978-969-472-235-1

فہرست

پیش نامہ

اکادمی ادبیات پاکستان نے 1990 میں پاکستانی زبانوں کے ممتاز تخلیق کاروں کے بارے میں "پاکستانی ادب کے معمار" کے عنوان سے ایک اشاعتی منصوبے پر کام شروع کیا تھا۔ معمارانِ ادب کے احوال و آثار کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے یہ کتابی سلسلہ بہت مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اکادمی، پاکستان کی تمام زبانوں کے نامور ادیبوں، شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کے بارے میں کتابیں شائع کر رہی ہے۔

پنجابی زبان کے ممتاز صوفی شاعر میاں محمد بخشؒ اپنے آفاقی پیغام اور اعلیٰ فنی محاسن کے سبب عالمی سطح کے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ تصوف میں سلسلۂ قادریہ کے جلیل القدر بزرگ تھے۔ دیندار، پاک نفس اور باعمل صوفی ہونے کے ساتھ ساتھ فقہ، حدیث اور تفسیر جیسے علومِ دینیہ میں بھی خصوصی دستگاہ رکھتے تھے۔ پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور عربی کے بھی بے بدل فاضل تھے۔ یوں تو حضرت میاں محمد بخشؒ کی کتابوں میں سوہنی مہینوال، تحفۂ میراں، قصۂ شیخ صنعاں، شیریں فرہاد، تحفۂ رسولیہ، قصہ شاہ منصور، سخی خواص خاں، مرزا صاحباں، ہدایت المسلمین، پنج گنج، ہیر رانجھا، گلزار فقیر اور تذکرۂ مقیمی جیسی شاہکار تخلیقات شامل ہیں مگر سیف الملوک آپؒ کی ایسی مثالی شعری تخلیق ہے، جس سے ایک دنیا واقف ہے۔ میاں محمد بخشؒ نے غنیمت کنجاہی کی مشہور فارسی مثنوی "نیرنگ عشق" کا پنجابی ترجمہ بھی کیا ہے، جو ادبی اعتبار سے ایک نادر شاہکار ہے۔

حضرت میاں محمد بخشؒ کے ہاں عشقیہ لوک داستانوں کی عارفانہ تفہیم اور پیش کش بہت ہی ارفع اور بلند تر درجے کی ہے۔ اندازِ بیاں ایسا ہے کہ یہ داستانیں لازوال بن گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپؒ نے پنجابی زبان و ادب کو گراں بہا خزانے عطا کیے اور اسے بے حد ثروت مند بنایا ہے۔

پیشِ نظر کتاب "میاں محمد بخشؒ: شخصیت اور فن" ملک کے معروف محقق پروفیسر حمید اللہ ہاشمی نے بڑی

توجہ اور محنت سے تحریر کی ہے۔ میاں محمد بخشؒ کی شخصیت اور فن کو متعارف کرانے اور ان کے کام کو سمجھنے، سمجھانے کے سلسلے میں یہ کوشش یقیناً معاون ثابت ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ اکادمی ادبیات پاکستان کا اشاعتی منصوبہ ''پاکستانی ادب کے معمار'' ادبی حلقوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی پسند کیا جائے گا۔

افتخار عارف

پیش لفظ

پنجابی زبان کے نامور شاعر اور درویش سیرت انسان میاں محمد بخشؒ پنجابی کی اس عظیم شعری روایت کی آخری کڑی ہیں، جس کا سلسلہ آغاز بابا فریدؒ سے ہوا۔ ان کی کتاب "سیف الملوک" پنجابی شاعری کا ایک شاہکار ہے۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی سیف الملوک کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ یوں تو میاں محمد بخشؒ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں لیکن جو شہرت اس کتاب کو ملی ہے وہ ان کی کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ ان کو زندہ جاوید بنانے والی کتاب "سفر العشق" (سیف الملوک و بدیع الجمال) ہی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے صرف ایک عشقیہ داستان ہی بیان نہیں کی بلکہ اپنے عقائد اور خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس میں زمانے کی سرد مہری اور ناقدری کا گلہ بھی کیا ہے۔ فن کی سچائی کا اظہار بھی کیا ہے اس میں انسانی دُکھ درد کا احساس بھی دکھائی دیتا ہے۔ اس میں خوبیوں اور سچائیوں کو پیش کرتے ہوئے، وہ زبان اور بیان کی خوبیاں بیان کرتے ہیں۔ میاں محمد بخشؒ نے اپنی اس شاہکار تصنیف میں دل و دماغ کے تمام مراحل کی بھر پور عکاسی کی ہے۔ حسن و عشق کے تمام معاملات کا واضح نقشہ کھینچا ہے۔ زندگی کی بے ثباتی اور بے بسی کے ہر پہلو کا کھل کر اظہار کیا ہے اور اس طرح پنجابی زبان کا یہ شاہکار وجود میں آیا۔

میاں محمد بخشؒ نے سیف الملوک کے مصائب کو یوں پیش کیا ہے جیسے یہ سب مصائب خود ان پر گزرے ہیں۔ اس چیز نے ان کے کلام میں غیر معمولی تاثر اور سوز و گداز پیدا کر دیا ہے۔ جس طرح وارث شاہ کی ہیر پنجابی زبان میں عشق و محبت کی سب سے دلکش اور مقبول ترین تصنیف ہے۔ اسی طرح میاں محمد بخشؒ کی سیف الملوک المیہ ادب کا سب سے بلند شاہکار ہے اور وارث کی ہیر کی طرح مقبول اور ہر دلعزیز بھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "سیف الملوک" کو شاہکار کی حیثیت حاصل ہے پنجابی زبان و ادب میں جو شہرت، ناموری اور مقبولیت میاں محمد بخشؒ کی اس تصنیف کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی اور کتاب کو نصیب نہ ہو سکی، لیکن ان کی فنکارانہ صلاحیت صرف اس کتاب ہی میں محدود نہیں ہے۔ اس سے قبل اور اس کے

بعد انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی بہت اہم ہے۔ ہم نے ان پر بھی سرسری نظر ڈالی ہے تاکہ ان کے فکر اور فن کے ارتقائی مراحل کا مقدم متعین کیا جا سکے۔ ہم نے ان کے حالات اور کلام کو آسان زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہر شعر کا اردو میں ترجمہ بھی درج کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ قارئین حضرات میاں صاحب کے کلام کو سمجھنے میں اسے مددگار پائیں گے۔

حمید اللہ شاہ ہاشمی

احوال و کوائف

ولادت

میاں محمد بخشؒ ۱۲۴۷ھ بمطابق ۱۸۳۱ء میر پور کے علاقہ کھڑی کے ایک گاؤں چک ٹھاکرہ میں پیدا ہوئے اس سنہ کا تعین میاں صاحب کی آخری تصنیف "ہیر رانجھا" کے ایک چومصرعے کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔(اس میں کتاب کا سال تصنیف بھی مذکور ہے)۔

تیراں سے تے پندرہ سن ھجری جدوں ایھہ رباعیاں آئیاں نی
موضع پنجنی بیٹھ کے نظم کیتی' جتھے بہت کماں بھیڑاں پائیاں نی
داھے چھ تے آٹھ سی عمر گزری' ہوشاں ھمتاں وچ خطایاں نی
سب شرم محمدا پیر نوں جی' جس دے کرم اتے آساں لائیاں نی

ترجمہ:

"۱۳۱۵ھ تھا' جب یہ رباعیاں قلمبند کی گئیں۔ میں نے موضع پنجنی میں قیام کے دوران انہیں نظم کیا۔ جہاں میں بہت سے کاموں میں گھرا ہوا تھا۔
میری عمر ۶۸ سال تھی۔ ہوش و حواس مضمحل ہو چکے تھے۔ میں نے اپنے پیر کے لطف و کرم کی آس پر قلم اُٹھانے کی جرأت کی ہے۔ اگر ۱۳۱۵ھ میں عمر ۶۸ سال ہو تو سال ولادت ۱۲۴۷ھ قرار پاتا ہے۔"

میاں صاحب کے کم و بیش تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی ولادت کا سال ۱۲۴۶ھ بمطابق ۳۱-۱۸۳۰ء تحریر کیا ہے۔ اور اس سنہ کا تعین "سیف الملوک" کے حوالے سے کیا ہے۔ جس میں ایک مقام پر میاں صاحب نے اس کا سنِ تصنیف رمضان ۱۲۷۹ھ (بمطابق مارچ ۱۸۶۲ء) بیان کیا ہے۔

سن مقدس ھجری دساں' باراں سے ست دا ھے
ست اتے دو ھور محمدؔ' اہر اس تہیں آھے
ماہ رمضان مبارك اندر وقت بہار گلابی

"سفر العشق" بنائی مولا ہووس فضل جنابی
عمر مصنف دی تد آہی تن داہے تن یکے
بھین وڈی فرماندی ایہو' ہتے رب نوں پکے

ترجمہ:

''میں آپ کو مقدس ہجری سن بتاؤں یہ بارہ سو سات تھا۔ سات پر دو اور بڑھا کر آگے لگا تو یہ مکمل ہو جائے گا' یعنی ۱۲۷۹ھ۔ ماہ رمضان میں موسم بہار میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے کتاب ''سفر العشق'' مکمل ہوئی۔ اس وقت مصنف کی عمر تین دس اور تین ایک تھے یعنی ۳۳ برس۔ میری بڑی بہن نے یہی بتایا ہے' باقی سچ بات تو خدا ہی جانتا ہے۔''

چنانچہ ۱۲۷۹ء میں سے ۳۳ (عمر مصنف) منہا کئے جائیں تو بطور تاریخ ولادت ۱۲۴۶ء برآمد ہوتا ہے۔ جب قاعدہ تقویم سے دریافت کیا تو ۳۳ سال پیچھے ۱۲۴۶ھ کا رمضان ۱۸۳۱ء کے مارچ اپریل میں گزرا۔ اس تاریخ ولادت پر اکثر و بیشتر لکھنے والے متفق ہیں تاہم اس ضمن میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) سیف الملوک والے حوالے میں:

"بھین وڈی فرماندی ایہو' ہتے رب نوں پکے"

کہہ کر میاں صاحب نے ایک حتمی رائے نہیں دی بلکہ اصلاح و تصدیق کی گنجائش رہنے دی ہے۔

(۲) ''ہیر رانجھا'' کے چو مصرعے میں عمر کا بیان اگرچہ زیادہ واضح ہے۔ یعنی

''داہے چھ تے اٹھ سی عمر گزری' ہوشاں ہمتاں وچ خطائیاں نی''

لیکن یہاں بھی ''ہوشاں ہمتاں وِچ خطائیاں'' کہہ کر شک ڈال دیا ہے۔

جائے پیدائش

چک ٹھاکرہ' ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو مزار حضرت پیرا شاہ قلندرؒ سے ایک فرلانگ شمال کی سمت واقع ہے۔ کھڑی شریف جو عموماً میاں صاحب کی جائے ولادت اور مسکن کے طور پر مشہور ہے۔ اصل میں کسی خاص گاؤں کا نام نہیں بلکہ پوری وادی جو دریائے جہلم سے لیکر میرپور کے پہاڑی سلسلے تک واقع ہے' کھڑی کہلاتی ہے۔ میاں صاحب کے کلام میں کھڑی کا ذکر جس انداز سے موجود ہے اس کا بغور مطالعہ کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ذکر کسی خاص گاؤں کا نہیں بلکہ ایک علاقے کا ہے۔

جہلم گھاٹوں پربت پاسے میرپورے تھیں دکھن
کھڑی ملک وِچ لوڑن جھڑے طلب بندے دی رکھن

(سیف الملوك)

ترجمہ:

"جہلم گھاٹ (دریا) سے شمال کی طرف اور میر پور سے جنوب کی جانب کھڑی واقع ہے جو مجھ سے ملنے کی خواہش رکھتے ہوں کھڑی علاقے میں میری تلاش کریں......

یہ مقام جہلم سے شمال کی جانب اور میر پور سے جنوب کی طرف نہر اپر جہلم کے قریب واقع ہے اور نہایت پُر بہار زرخیز علاقہ ہے۔"

"قصہ شیخ صنعان" میں تحریر فرماتے ہیں:

"چھ کوہ پربت جھلم گھاٹوں کھڑی ملك وِچ ڈیرا"

"پاك مقام اِك پیرا شاھی اوہ ھے مولا میرا"

"نیرنگ عشق" میں تحریر کرتے ہیں......

جے شاعر دا پچھے کوئی جائے بسرام

ملك ھے پاس جھلم دے کھڑی نام

"امپیریل گزٹ آف انڈیا" (ص ۷۸) کے مطابق اس وادی کا عرض اندازاً دو میل اور طول پندرہ میل ہے۔ اس کی زمین زرخیز اور شاداب ہے۔ اس میں ۸۴ کے لگ بھگ گاؤں آباد ہیں۔ چک ٹھاکرا گواں میں نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے میاں صاحب نے "شیریں فرہاد" میں ذکر کیا ہے۔

کھڑی اندر چك ٹھاکرا پنڈ وڈا سردار

ترجمہ:

"علاقہ کھڑی میں سب دیہات کا سردار چک ٹھاکرا ہے۔"

چک ٹھاکرہ کے پُر فضا ماحول نے انہیں فطرت کی رعنائیوں کا شیدائی بنایا تو ان کے والد میاں شمس الدینؒ کی تربیت نے انہیں روحانی اقدار و روایات کا پیرو بنایا۔

خاندان

میاں محمد بخشؒ کے آباؤ اجداد ضلع گجرات کے ایک گاؤں چک بہرام سے تعلق رکھتے تھے اس خاندان کے چند افراد اب بھی اس گاؤں میں رہائش پذیر ہیں۔ یہاں زیادہ تر اس علاقہ کی معروف قوم گوجر آباد ہے۔ میاں صاحب بھی اسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی گوت پسوال تھی جو گوجروں کی ایک سرکردہ شاخ ہے اور ضلع گجرات میں خاصی تعداد میں آباد ہے۔

آپ کے جدِ امجد دین محمد تھے' جو اٹھارھویں صدی میں پنجاب وکشمیر کے ایک صاحب کرامت بزرگ حضرت غازی عبداللہ المعروف پیرا شاہ غازی کے زیرِ سایہ پروان چڑھے تھے۔ حضرت پیرا شاہ کا موضع ٹھٹھہ موسیٰ ضلع گجرات سے تعلق تھا اور ایک باصفا روحانی خانوادے کے فرد تھے۔ جنہوں نے فیض باطنی کے لئے حجرہ شاہ مقیم کے حضرت بالا پیرؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔

ایک مرتبہ وہ پیرو شاہ کے قریب قیام پذیر ہوئے جو اسی نواح میں ایک معروف قصبہ ہے۔ چک بہرام کی ایک عورت جو آپ کے خورد ونوش کا اہتمام کرتی تھی اس کے گھر کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ عرض گزار ہوئی کہ آپ دعا فرمائیں کہ میری گود ہری ہو جائے آپ نے فرمایا: اچھا شرط یہ ہے کہ اس بچہ کو میں اپنے ساتھ رکھوں گا۔ وہ رضامند ہوگئی۔ آپ نے دعا فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے اُسے اولاد سے نوازا۔ بچے کا نام دین محمد رکھا گیا۔ جب اس نے ذرا ہوش سنبھالی تو آپ اسے ہمراہ لے آئے۔ اِدھر اُدھر پھرتے پھراتے پہلے بوڑا جنگل اور پھر میرپور کے پاس چک ٹھاکرا میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان کی عبادات ومجاہدات اور صوفیانہ کمالات کا شہرہ پھیل گیا۔ اس علاقے میں ان کی متعدد نشست گاہیں اور مقامات مجاہدہ وریاضت موجود ہیں اور عقیدت مند اِن کی زیارت کرتے ہیں۔

پیرا شاہ غازیؒ

پیرا شاہ غازیؒ' دمڑی والی سرکار کے نام سے بھی مشہور ہیں' اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ان کی خدمت میں جو گرانقدر نذرانے پیش کئے جاتے تھے۔ اِن میں سے آپ عقیدت مندوں کا دِل رکھنے کے لئے صرف ایک دمڑی قبول فرماتے تھے۔

حضرت پیرا شاہ غازیؒ کی وجہ سے اس علاقے میں روحانی اقدار کا بول بالا ہوا' اور عقیدت مند دور دور سے آنے لگے۔ آپ نے ۱۴ شعبان ۱۱۶۳ھ بمطابق ۱۹ جولائی ۱۷۵۰ء بروز اتوار بوڑا جنگل کے مقام پر وفات پائی۔ چک ٹھاکرا کے مقام پر دفن کئے گئے۔ جہاں آپ کا مزارِ پُر انوار زیارت گاہ خاص وعام ہے۔ میاں محمد بخشؒ فرماتے ہیں:.......

پیر میرا اوہ دمڑی والا' پیرا شاہ قلندرؒ
ھر مشکل وِچ مدد کردا' دوھاں جھاناں اندر

ترجمہ:

''میرا پیر دمڑی والا پیرا شاہ قلندر ہے۔ وہ ہر مشکل میں دونوں جہانوں میں مدد کرتا ہے۔''

میاں صاحب نے اس شعر کو اپنی تین کتابوں ''سیف الملوک' قصہ سخی خواص خاں اور مرزا صاحباں'' میں درج کیا ہے۔ اس سے اس شعر کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت پیرا شاہؒ کی زندگی میں رہبانیت اور ترکِ دنیا بالکل نہ تھی' بلکہ مکمل شرعی انداز لئے ہوئے تھی۔

آپ کے اہل وعیال کا ذکر بھی ملتا ہے' جو پرانے میر پور میں مسجد سراجاں کے پاس قیام پذیر تھے۔ لیکن اپنے روحانی ورثہ کا حامل آپ نے دین محمد کو قرار دیا جنہوں نے ان کی بھر پور خدمت کی تھی......اور ان سے براہِ راست فیض باطنی حاصل کیا تھا۔ میاں محمد بخشؒ نے اپنی تصنیف ''تذکرہ مقیمی'' میں تحریر فرمایا ہے: کہ حضرت کو دین محمد سے بہت محبت تھی۔ نہایت شفقت سے دوش مبارک پر اُٹھا کر لے جاتے اور بیٹا ہی فرماتے' نیز یہ کہ جب وہ بالغ ہوئے تو حضرت کی توجہ سے کامل اکمل ہو گئے۔

خلیفہ دین محمد

چنانچہ دین محمد آپ کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ میاں صاحب لکھتے ہیں کہ آپ کا عہد بڑا بابرکت تھا۔ آپ کے فیضِ صحبت سے مردہ دلوں کو حیاتِ ابدی ملی اور آپ کی توجہ باطنی سے مریدوں نے اعلیٰ مدارج طے کئے۔ ان کے بعد اِن کے برادرِ خورد میاں شہباز خلیفہ ہوئے۔ ان کا لقب میاں ڈھیرو صاحب مشہور تھا۔ آپ رات دن استغراق اور بے خودی کی حالت میں رہتے تھے۔ ان کے بعد خلافت میاں جیون کے پاس آئی۔ وہ عبادت وریاضت کا گہرا انہماک رکھتے تھے۔ باوجود صدہا خدام کے خود زمین میں ہل چلایا کرتے ایک دفعہ ایک مفلس کاشتکار نے آپ سے ہل چلانے کا ایک آلہ طلب کیا۔ آپ نے دے دیا۔ جب وہ تھوڑی دور گیا تو واپس بلا کر تمام اسباب ہل مع جوڑا بیل اس کو بخش دیئے۔

میاں جیون کے چار بیٹے تھے۔ قادر بخش' کریم بخش' الٰہی بخش اور شمس الدین...... اِن میں سے میاں شمس الدین خلیفہ مقرر ہوئے جو میاں محمد بخشؒ صاحب کے والدِ گرامی تھے۔ میاں شمس الدین بھی ایک عارف کامل اور صاحب کرامت بزرگ تھے' بڑے رحیم اور نرم دل۔ انسانوں کے علاوہ اگر کسی جانور کو بھی تکلیف میں دیکھ لیتے تو بے چین ہو جاتے۔ اِن کی روحانی فتوحات کے متعدد واقعات میاں صاحب نے اپنی تصنیف ''تذکرۂ مقیمی'' میں درج کئے ہیں۔ آپ نے ۱۲۶۴ھ /۱۸۴۸ء میں وفات پائی۔ آپ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بہاول بخش سب سے بڑے تھے' جو آپ کے بعد خلیفہ بنے۔ اِن کا اِنتقال ۱۲۹۸ھ /۱۸۸۱ء میں ہوا۔ تیسرے بیٹے میاں علی بخش ۱۲۷۰ھ / ۵۴-۱۸۵۳ء میں جوانی ہی میں فوت ہو گئے۔ صاحبزادی کی شادی میاں کا کو سے ہوئی تھی۔ یہ میاں محمد بخشؒ سے عمر میں بڑی تھیں۔ میاں محمد بخشؒ نے مجرد زندگی گزاردی۔ باقی خاندان کا سلسلہ بھرپور انداز سے جاری وساری رہا۔

تربیت

میاں صاحب نے ایک ایسے آسودہ حال گھر میں آنکھ کھولی' جہاں آسودگی زندگی پر حاوی نہ تھی۔ میاں شمس الدین دربار حضرت پیرا شاہ کی سجادگی کے ساتھ کاشتکاری کرتے امامت اور وعظ ونصیحت کی

ذمہ داری نبھاتے۔ان کی زوجہ بھی مثالی کردار کی حامل تھیں۔میاں صاحب کو بچپن ہی میں اچھے اخلاق و اطوار کی تربیت حاصل ہوئی۔ بچپن سے ہی پڑھنے لکھنے اور گھڑ سواری اور ورزش جیسی صحت مندانہ روایات سے بیک وقت دلچسپی پیدا ہوئی۔جس نے آگے چل کر ایک انتہائی متحمل مزاج، بُردبار، باعزم اور ذہین و علیم دوست ذہن کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ بچپن سے ہی سنجیدگی متانت اور غور وفکر کی کیفیت نمایاں تھی۔خاموش رہنے اور کم بولنے کی طرف رُجحان تھا۔

ابتدائی تعلیم وتربیت والد صاحب کی زیرِ نگرانی حاصل کی، بعد میں مزید تعلیم کے لئے تقریباً پانچ کوس کے فاصلے پر واقع موضع سموال شریف کی معروف درس گاہ میں حاضر ہوئے۔وہاں آپ کے حقیقی علمی ذوق کی تشکیل ہوئی۔سموال شریف کی تعلیمی درسگاہ میں جن اساتذہ کرام کے فیضان کرم سے آپ فیضیاب ہوئے ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:

(۱) حافظ نور محمد صاحب المعروف حافظ نور ولیؒ (۲) حافظ محمد علیؒ

(۳) حافظ غلام حسین (۴) حافظ ناصر الدین صاحب

......مولوی غلام حسین صاحب سے حدیث پڑھی، حافظ ناصر نے دیگر دینی علوم کے علاوہ شعروادب کے ضمن میں بھی رہنمائی کی۔آپ نے سموال شریف کی درسگاہ سے جو استفادہ کیا۔اس کا گہرا احساس آپ کو عمر بھر رہا۔اور آپ کی تصانیف میں بھی اس کا اعتراف موجود ہے۔

اسی احساس ممنونیت کی وجہ سے آپ نے ''شیریں فرہاد'' میں سموال شریف کے علمی اور ادبی خانوادے کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

بعد اس تھیں اُستاد ھے حافظ نور ولی
گھر حافظ محمود دے روشن شمع بلی
چانن لگا اوس دا ھر ھر شھر گلی
تك اوھنوں شیطان دی جاندی جان گلی
وِچ ولایت علم دے اوس دی نھر چلے
دیوا سی گھر فقر دے عشقوں سدا جلے
جے اوہ سُکّے رُکھ تے کردا نظر بھلی
رب اوسنوں ھر بار دا لاگے پُھل پھلی
صفت اوسدیدی گل سی ملکاں وچ بھلی
چرہ وانگن خضر دے جائے نه جھال جھلی

ترجمہ:

''اس کے بعد میرا استاد حافظ نور ولی ہے جس نے حافظ محمود کے گھر میں ایسی شمع

روشن کی، جس کی روشنی ہر شہر اور ہر گلی میں پھیل گئی۔ اسے دیکھ کر شیطان کی جان جاتی ہے۔ علم کی ولایت میں اس نے نہر جاری کی ہے۔ وہ فقراء کے گھر میں چراغ تھا جو عشق کی بدولت سدا روشن رہا۔ اگر وہ سوکھے درخت پر بھلی نظر ڈالے تو وہ درخت ہر طرح کے پھل اور پھول لانے لگتا ہے۔ اس کی خوش خلقی کی تعریف دُور دُور تک جاتی ہے۔ اس کا چہرہ خضر کی طرح روشن ہے، جس کی تاب نہیں لائی جاسکتی۔"

...... چونکہ میاں صاحب کی واحد باقاعدہ درسگاہ یہی تھی۔ اس لئے ان کی علمی فضیلت اور تصانیف کی روشنی میں بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جملہ علوم متداولہ میں انہوں نے خاص مہارت حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپؒ نے درویشی اختیار کر کے مصروف ریاضت ہو گئے۔ بچپن ہی سے میاں صاحب کا دل فقر و غنا کی منزلیں طے کرنے کے لئے بیتاب تھا۔

سجادگی

میاں صاحب کی عمر ابھی سولہ سترہ سال تھی کہ ان کے والد بسترِ علالت پر پڑ گئے۔ ایک دن انہوں نے علاقہ کے سرکردہ افراد اور مریدانِ خاص کو بلایا اور چند نصائح ارشاد فرمانے کے بعد یہ خیال ظاہر کیا کہ اب زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بات کا باقاعدہ اعلان کر دوں کہ میرے بعد سجادگی میرے بیٹے میاں محمد بخشؒ سنبھال لیں۔ حاضرین نے ان کی تائید کی۔ کیونکہ وہ محمد بخشؒ کی ذہانت کے قائل تھے۔ محمد بخشؒ بصد احترام اُٹھے اور والد گرامی اور عمائدین کا اس اعتماد و اعزاز کے لئے شکریہ ادا کیا۔ مگر اس منصب کو سنبھالنے سے معذرت کرتے ہوئے تجویز کیا یہ اعزاز برادرِ کلاں میاں بہاول بخش کو تفویض کیا جائے۔ وہ اس کے زیادہ مستحق ہیں۔ اس سے پہلے آپ نے اپنے والد صاحب سے ایک سچا فقیر بننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ والد نے اپنے بیٹے کی اس انکساری اور برادر نوازی کو بنظرِ تحسین دیکھا، اور وفورِ جذبات سے اسے گلے لگا لیا۔ اور بارگاہِ ایزدی میں یوں ملتجی ہوئے:

"اے پروردگار تو علیم و بصیر ہے، میرے اس کم سن بیٹے نے کبھی کسی دنیوی کام یا جسمانی حاجت کی آرزو نہیں کی۔ تیری اور فقط تیری رضا کا طالب رہا ہے۔ میں اسے تجھ کو سونپتا ہوں۔ یا اللہ اس بچے کو اپنے بندوں کی صف میں کھڑا کرنا"۔

یہ واقعہ میاں صاحب کی زندگی کے ایک اہم پہلو کی نشاندہی کرتا ہے۔ آپ ساری زندگی اپنے عزیزوں، بھائیوں دوستوں، مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ اسی قربانی عالی ظرفی اور انسان دوستی کا برتاؤ کرتے رہے، خود محرومیاں دامن میں سمیٹتے رہے لیکن دوسروں کو نوازتے رہے اور خوشیاں بانٹتے رہے۔ اُنہوں نے خود دوسروں کے لئے ایثار، رفاقت اور محبت کو شعار بنایا۔ شاید اس کی نفسیاتی وجہ خود

محبت اور شفقت سے محرومی اور اہل و عیال کا نہ ہونا تھا۔

جب ۱۲۹۸ھ میں میاں بہاول بخش نے وصال فرمایا تو پھر میاں صاحب گدی نشین بنے۔

میاں صاحب طبعاً بہت حساس واقع ہوئے تھے۔ مزاج میں شاعرانہ احساس بچپن ہی سے رچا بسا ہوا تھا۔ جوانی کی ان ابتدائی منزل میں بھرپور سماجی مصروفیات کے ساتھ ساتھ اندر ہی اندر ایک حساس شاعر کروٹیں لے رہا تھا۔ انہی دنوں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے ان کی زندگی کا رخ ہی تبدیل کر کے رکھ دیا۔ عام تذکرہ نگار نامعلوم کن وجوہات کی بناء پر اس واقعہ کی طرف دھیان نہیں دیتے بلکہ آنکھیں چرا کر گزر جاتے ہیں۔ حقیقت میں یہ نکتہ میاں صاحب کی شخصیت اور ان کی ہیئت قلبی کو سمجھنے میں بے حد ممد و معاون ہے۔ اس میں کسی طرح بھی ان کی توہین یا کسر شان کا پہلو نہیں نکلتا بلکہ ان کی شاعری کے بہت سے اسرار منکشف ہو جاتے ہیں' وہ یہ کہ آپؒ نے بعض خاص وجوہات کی بنا پر ساری زندگی شادی نہیں کی۔ میاں صاحب کے مرید خاص ملک محمد صاحب نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ''حضرت قبلہ سجادہ نشین دربار نے ایک عفیفہ سے اپنے خاندان میں نسبت شادی قرار دے رکھی تھی' ان سے بھی مع تمام علائق تعلق قطع کیا۔ تمام عمر شادی نہیں کی۔

بعض روایات کے مطابق چھوٹے بھائی علی بخش مجذوب تھے اور یہ رشتہ بڑے بھائی کو دیا گیا تھا۔ کرم حیدری نے ''پوٹھواری گیت'' میں لکھا ہے کہ روایت ہے کہ میاں صاحب موصوف کا رشتہ بچپن ہی میں ایک جگہ طے پا گیا تھا۔ جب آپ ذرا بڑے ہوئے تو آپ کو کلھڑ نکل آیا جو رفتہ رفتہ آپ کی شکل و صورت میں ایک نمایاں عیب بن گیا۔ اس بناء پر لڑکی والوں نے رشتہ توڑنا چاہا' لیکن ان کے خاندان کی دینی اور دنیوی وجاہت کے پیش نظر انہیں یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ پورے طور پر قطع تعلق کر لیں۔ چنانچہ وہی رشتہ ان کے چھوٹے بھائی کو دے دیا گیا۔ اس درویش صفت انسان کو نہ رشتہ ہونے' نہ اس کے منتقل ہونے کی کوئی خبر تھی۔ چھوٹے بھائی کی بارات کے ساتھ گئے۔ اتفاقاً وہاں کسی عورت نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی دوسری عورت سے کہا ''وہ رہا بدصورت لڑکا جس کا رشتہ چھڑا کر ہم نے اس کے چھوٹے بھائی کو دیا ہے''۔ یہ بات کچھ اس انداز سے کہی گئی تھی کہ جیسے میاں محمد بخشؒ کو سنانا مقصود تھا۔ ان کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ حسنِ ظاہر کی کمی نے انہیں ایک لڑکی سے محروم کر دیا تھا۔ اس لئے انہوں نے حسنِ باطن کی طرف توجہ دی تاکہ اس کے وسیلے سے محبوبِ حقیقی کو حاصل کر سکیں' طبیعت پہلے ہی درویشانہ تھی۔ اب دنیا سے بالکل ناتا ٹوٹ گیا۔ اللہ سے لو لگا کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔

بیعت

تعلیمی مراحل طے ہو چکے تھے' طبیعت کی بے چینی اب تلاشِ مرشد میں سرگرداں ہوئی کیونکہ خود ارشاد فرماتے ہیں!

کاربناں استاد تھیں کوئی نہ ہووے راس

پنجاب کے کئی شہروں کا سفر کیا اور متعدد صوفیائے کرام سے ملاقاتیں کیں، لیکن مقصد پورا نہ ہوا۔ تلاشِ مرشد کے لئے استخارہ کیا۔ پیرا شاہ غازیؒ نے خواب میں رہنمائی فرمائی، اور کہا کہ میرے روحانی فرزند سائیں غلام محمد ساکن کلروڑی سے بیعت کرلو...... سائیں غلام محمد صاحب کا پیرا شاہ غازی سے روحانی تعلق اِس طرح بنتا تھا کہ سائیں صاحب کے مرشد بابا بدوح (م ۲ ذی قعدہ ۱۲۷۴ھ / ۱۴۔ جون ۱۸۵۸ء) تھے۔ جن کے مرشد حضرت بابا جی المعروف بگا شیر (جن کا مزار موضع درکالی تحصیل گوجر خان میں ہے) حضرت پیرا شاہؒ کے مرید تھے۔

حضرت دمڑی والا کے بارے میں میاں محمد بخشؒ نے ''سیف الملوک'' میں ''در مدح جناب مرشد ہادی حضرت پیر پیرا شاہ غازی قدس اللہ سرۃ العزیز'' کے زیر عنوان لکھا ہے۔

شاہ سلطان اونہاں دے بوھے عاجز بن دکھاندے
عاجز اس دے شاہ سداون اسدا مان رکھاندے
اس در دے سگ عاری کولوں شیر ببر بھو کردا
اگے چڑھے نہ چڑی اوھدی دے باز شکاری ڈردا
باد شھاں دا پیر کھاوے پیراں شاہ کر جاتا
پیرا شاہ قلندر غازی نت سوا لکھ داتا
سیك لگے جد سیوك تائیں ترت سنے فریاداں
پھنچے کر تاکید، محمدؐ پان مرید مراداں

ترجمہ:

''ان کے در پر بادشاہ غلام بن جاتے ہیں، اور ان کے غلام بادشاہ کہلاتے ہیں، اس طرح ان کی عزت ہوتی ہے۔
ان کے در کے کتوں سے شیر ببر ڈرتے ہیں، وہاں کی چڑیا سے شکاری باز بھی خوف کھاتا ہے۔ وہ بادشاہوں کے پیر کہلاتے ہیں اور پیروں کو بادشاہ بنا دیتے ہیں اور یہ پیرا شاہ قلندر غازیؒ ہیں جو ہمیشہ کے لکھ داتا ہیں، جب سائل دل سے سوال کرتا ہے تو وہ اس کی فریاد سُن لیتے ہیں۔ میاں محمد بھی ہدایت کے مطابق اس در پر پہنچ گیا ہے جہاں مرید اپنی مرادیں حاصل کرتے ہیں۔''

سائیں غلام محمد صاحب سے بیعت میاں صاحب کی زندگی میں ایک نیا موڑ ثابت ہوئی اور اُنہوں نے اپنے مرشد سے بے پناہ فیض روحانی حاصل کیا۔ سیف الملوک میں اُنہوں نے اپنے مرشد کا ذکر

جس انداز سے کیا ہے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس درجہ متاثر کن شخصیت کے مالک تھے۔

مرد بھلیرا مرشد میرا شاہ غلام محمد
اھلِ شریعت اھلِ طریقت وانگ امام محمدؒ
محرم حال حقیقت کولوں واقف سی عرفانوں
پرتقصیراں نوں تاثیراں هوون اوس زبانوں
سینہ سرِّ الٰھی بھریا متھا چن اسمانی
چشماں شرم حیائوں بھریاں روشن دویں جھانی
رحمت حلم وفا محبت چارے طبعاں رلا کے
رب اوہ شخص شریف بنایا نیك صفاتاں پا کے
تن من اندر راہِ حقانی اندر دین پیغمبرؐ
سالك صوفی نالے زاھد نالے مست قلندر

ترجمہ:

''میرے مرشد غلام محمد ایک بھلے انسان ہیں اور وہ امام محمد کی طرح اہلِ شریعت اور اہلِ طریقت ہیں۔ وہ حقیقت کے محرم اور عرفان کے واقف ہیں۔ان کی زبان سے پُر تقصیر انسانوں پر بھی اثر ہوتا ہے۔ان کا سینہ الٰہی بھیدوں سے پُر ہے اور پیشانی آسمانی چاند کی سی ہے۔ان کی آنکھیں شرم وحیا سے پُر ہیں۔اور دونوں جہانوں میں روشنی عطا کرتی ہیں۔رحمت، حلم، وفا اور محبت کے چار عناصر کو ملا کر وہ نیک صفت اور شریف ہستی بنائی گئی ہے۔ان کے تن من کے اندر حقانی حقائق سموئے ہوئے ہیں۔وہ پیغمبرؐ کے دین کے پیروکار ہیں۔وہ سالک، صوفی، زاہد اور مست قلندر بھی ہیں......''

اس خاکے میں میاں صاحب نے ایک مرشد کامل کے کردار کے اہم اوصاف بیان کئے ہیں۔دراصل یہ سب مل کر بندۂ مومن کی صفات کا مرقع ہے۔قصہ ''سوہنی مہینوال'' میں میاں محمد بخشؒ نے سائیں غلام محمد کی شخصیت کے اس پہلو کو خوب واضح کیا ہے کہ انہوں نے حکمرانی چھوڑ کر درویشی اور محنت سے روزی کمانے کو اپنا شعار بنایا۔

''تذکرہ مقیمی'' میں میاں صاحب نے اپنے مرشد حضرت غلام محمد کا تفصیل سے ذکر کیا ہے لکھتے ہیں کہ وہ قائم اللیل اور صائم الدہر تھے۔اکثر اوقات استغراق کی کیفیت اور محویت طاری رہتی، جنگلوں اور ویرانوں میں نکل جایا کرتے تھے۔کئی کئی دن غائب رہتے۔متعلقین آپ کو تلاش کر کے لاتے، کھانا

روبرو رکھا جاتا۔ قلیل مقدار میں غذا تناول فرما کر الگ ہو جاتے' جو کچھ آ جاتا کسی کو دے دیا کرتے۔ پارچات تک بدن سے اُتار کر ایثار کر دیتے۔ بسا اوقات صرف کمر میں ایک تہ بند ہی رہ جاتا۔ باوجود استغراق اور حالتِ وجد میں اوقات نماز اور فرائض سنن کی پابندی میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ کہ ان کا زُہد اور ریاضت اِنتہائی طاقتِ بشری تک پہنچ گیا تھا۔ کسی وقت عبادت اور ریاضت سے فارغ ہوا کرتے تھے۔ دنیاوی زر و مال کی آپ کی نگاہ میں کوئی قدر نہ تھی۔

با قاعدہ بیعت کے بعد میاں صاحب کا روحانی سفر زیادہ بھرپور ہو گیا۔ مرشد کے حکم پر آپ کشمیر تشریف لے گئے اور سری نگر کے معروف بزرگ شیخ احمد ولی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ کشمیر کے اسی سفر کے دوران آپ کو اہلِ کشمیر کی زبوں حالی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

خلائق دنیا سے ربط تو پہلے ہی برائے نام تھا۔ اب مکمل طور پر عبادت و ریاضت اور مجاہدہ میں مستغرق ہو گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کی شہرت بحیثیت ایک ولی کامل دُور دُور تک پھیلتی گئی۔ اور عقیدت مند دریائے معرفت سے فیض یاب ہونے کے لئے حاضر ہونے لگے۔ آپ کے سوانح نگاروں نے متعدد کرامات بیان کی ہیں' جن کی تفصیل پڑھ کر اس بات میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ اہل اللہ میں سے تھے......

میاں محمد بخشؒ نہایت عابد و زاہد تھے۔ مراقبے میں بیٹھتے تو پہروں سر نہ اُٹھاتے تھے۔ دُنیا اور اربابِ دنیا سے یکسر بے نیاز تھے۔ ان کے روحانی کمالات اور ریاضت کی شہرت ہوئی تو مہاراجہ کشمیر نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن میاں محمد بخشؒ نے پرواہ تک نہ کی۔

دینی اکابر سے عقیدت آپ کی زندگی کا ایک لازمی جزو تھی۔ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضری کے لئے متعدد بار آپ لاہور تشریف لے گئے۔ حجرہ شاہ مقیم وغیرہ' جانی چک وغیرہ اسی ضمن میں بزرگوں کے مزارات پر با قاعدہ سے حاضر ہوتے۔ حضرت غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی کی ذات سے خصوصی عقیدت تھی۔ جس کا ثبوت ان کے لاتعداد اشعار اور متعدد تصانیف کی صورت میں موجود ہے۔

میاں محمد بخشؒ کی شخصیت

میاں صاحب دراز قامت تھے۔ رنگ گندمی مائل بہ سفیدی' جسم طاقتور اور اعضا نہایت متناسب و موزوں۔ اوائل عمر میں انہیں صحت مندانہ کھیلوں سے خاص دلچسپی تھی۔ تلی (ہتھیلی) کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ اس کھیل میں دو آدمی آمنے سامنے بیٹھ کر ایک دوسرے کی ہتھیلیوں کو بار بار دباتے اور دھکیلتے ہیں' اور جو مخالف کی ہتھیلی کو زمین بوس کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا وہ جیت جاتا تھا۔ میاں صاحب اس کھیل میں ہمیشہ کامیاب رہتے تھے۔ گھڑ سواری کے بہت شائق تھے۔

ایک عمدہ گھوڑی خود پال رکھی تھی۔ بہادری کے جوہر آپ کی طبیعت میں موجود تھے۔ مزار کے علاقے میں واقع کنواں پر سے پاؤں کے دونوں انگوٹھے باندھ کر پھلانگ جایا کرتے تھے۔ ورزش اور کشتی سے خاص دلچسپی تھی۔ کھیتی باڑی کا بھی شوق رہا۔ بچپن میں والد صاحب کا ہاتھ بٹایا کرتے تھے لیکن یہ ساری سرگرمیاں اوائل عمر کی تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ انہماک عبادت وریاضت کی طرف ہو گیا اور نفس کشی اور ریاضت کی وجہ سے آخری عمر میں مشتِ استخواں ہو کر رہ گئے تھے۔ خوراک بہت سادہ تھی۔ ایک چپاتی صبح اور ایک شام۔ سالن میں پانی ملا کر اسے بدمزہ کر لیتے تھے کہ کہیں زبان لذت آشنا نہ ہو جائے۔

طبیعت میں بردباری کا عنصر غالب تھا۔ ہر ایک سے محبت اور خلوص سے پیش آتے' خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہر ایک کا ادب کرتے۔ بڑے آرام سے شیریں لہجے میں گفتگو فرماتے' بہت مہمان نواز تھے' کسی کو بغیر تواضع کے جانے نہ دیتے تھے۔ لنگر ہمیشہ جاری رہتا۔ دونوں وقت سو پچاس آدمی وہاں سے کھانا کھاتے تھے۔ چار آدمی خاص طور پر آنے والے مریدوں کی خدمت کے لئے وقف تھے۔

عبادت' مطالعہ اور تدریس کے ساتھ ساتھ عوام کے مسائل سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اکثر لوگ جونذر نیاز لے کر حاضر ہوتے رہتے اسے آپ یتیموں اور بیواؤں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ پنجن کے ایک یتیم بچے غلام محمد کو آپ نے بیٹوں کی طرح پالا پوسا۔ اسی طرح لوگوں کے تنازعات کا فیصلہ کراتے' ناراض لوگوں کی صلح صفائی کراتے۔ بچوں سے بہت محبت تھی ان کے کھیلوں میں خاص طور پر دلچسپی لیتے تھے اور ان میں کشتی کے مقابلے بھی کراتے تھے۔

موسیقی اور خوش الحانی سے خاصا شغف رکھتے تھے۔ پنجن کے ایک ہندو کنہیا سے بانسری سُنتے تھے۔ علمِ موسیقی پر گہری نظر رکھتے تھے' اس کی اصطلاحات اور نکات پر کامل دستگاہ تھی۔ اپنے کئی عقیدت مندوں سے جن میں حافظ کرم داد (دھنی) بھی شامل تھے سیف الملوک ترنم سے سُنتے تھے۔ پنجن کے ایک کمہار سملی سے سیف الملوک بھی سُنا کرتے تھے۔ کبھی کبھار پنجن کی عورتوں سے مقامی گیت بھی سُنا کرتے تھے۔

اچھی آواز سے فریفتگی کا ثبوت سیف الملوک کے کئی اشعار سے بھی ملتا ہے۔

کرے سوال فقیر' محمد' پڑھنے والے تائیں
رونق کھڑیں نہ شعر میرے دی نال ادا سُنائیں
باجھ ادا آواز رسیلے' لگدا شعر الوناں
دُدّھ اندر جے کھنڈ رلایئے مٹھا ہوندا دوناں
سَٹ پسَٹا کرکے پڑھیاں' لذت کجھ نہ رہندی
جس دے بیٹے نوں کوئی مارے کد اُسدی جند سہندی
جیونکر بیٹے تساں پیارے' تیویں بَیت آسانوں

بیٹے نوں کوئی اُنگل لائے لگدے بیت تسانوں

دشمن وانگ دسے اوہ سانوں جیکوئی بیت تروڑے

بیٹے نازک' لال سُندر دے' ایویں کَنّ مروڑے

رَبّا' دیئیں پناہ انہاں تھیں جو ایسے کم کردے

سیم سُچے دا ستم بناون عم دا نے غم کردے

ترجمہ:

''فقیر (درویش) محمد پڑھنے والوں سے یہ سوال (گزارش) کر رہا ہے کہ میرے شعر کی رونق کو برباد نہ کرنا۔ اسے خوش الحانی کے ساتھ پڑھیں۔ رسیلی آواز کے بغیر شعر بے مزہ اور پھیکا لگتا ہے۔ دُودھ کے اندر اگر چینی ملائی جائے تو دُگنا میٹھا ہو جاتا ہے۔ (یہی حال اشعار کا ہے)۔ لاپروائی اور اچھی آواز کے بغیر پڑھنے سے اس کی لذت باقی نہیں رہتی۔ جس کے بیٹے کو کوئی مارے وہ کب برداشت کرسکتا ہے۔ جیسے تمہیں بیٹے پیارے ہیں۔ ویسے ہی ہمیں اپنے اشعار عزیز ہیں۔ اگر بیٹے کو کوئی ذرا سی چوٹ لگائے' تو تمہیں خود کو بید لگتے محسوس ہوتے ہیں ایسے ہی ہمیں تکلیف محسوس ہوتی ہے' ہمیں وہ شخص دُشمن کی مانند لگتا ہے جو بیت میں تبدیلی کرے' بیت میں تبدیلی کرنا ایسے ہے جیسے کوئی سُندر لال یعنی پیارے بیٹے کے کان مروڑے۔ اے خدا' ہمیں ایسے لوگوں سے پناہ دے جو ایسے کام کرتے ہیں۔ وہ ''سیم'' کو ''ستم'' اور ''عم'' کو ''غم'' بنا دیتے ہیں......''

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ میاں صاحب کو خوش الحانی اور شعر ٹھیک طرح پڑھنے کا کس حد تک خیال تھا۔ موسیقی سے ان کی غیر معمولی دلچسپی ظاہر ہوتی ہے۔ کئی مقامات پر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ موسیقی کے دقیق رموز پر ماہرانہ نظر رکھتے تھے۔ اور انہیں موسیقی کی اصطلاحات اور نکات پر کامل عبور تھا۔ موسیقی سے اس دلچسپی کی وجہ سے کئی خوش الحان حضرات نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر سیف الملوک سُنائی۔

مجموعی طور پر مزاج پر کنارہ کشی بتدریج غالب ہوتی گئی۔ استغناء کی کیفیت یہ تھی کہ ساری عمر کسی راجہ' امیر یا رئیس کی ملاقات کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔

وفات

جنوری ۱۹۰۷ء کے اواخر میں ایک شام مغرب کی نماز ادا کرنے کے لئے وضو فرما کر اپنے حجرہ میں

آگ تاپنے کے لئے بیٹھے تو بدن میں کمزوری محسوس ہونا شروع ہوئی اور ایک جانب جھک گئے۔ خدام نے فوراً چارپائی پر لٹا دیا۔ یہ فالج کا ایک مہلک حملہ تھا۔ ایک دن اور ایک رات غشی کی کیفیت طاری رہی۔ ۷ ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ کی رات بارہ بجے بمطابق ۲۱ جنوری ۱۹۰۷ء بروز سوموار روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

آپ کی نماز جنازہ آپ کی وصیت کے مطابق حضرت قبلہ حافظ مطیع اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ ساکن سوال شریف (جو آپ کے استاد محترم کے صاحبزادے اور آپ کے ہم مکتب نیز ایک بلند پایہ علمی شخصیت تھے) نے پڑھائی۔

نماز جنازہ میں ہزارہا عقیدت مندوں نے شرکت کی۔ حضرت پیرا شاہ کے مزار کے پاس آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ جہاں آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی قبر بنوار کھی تھی۔

ان کے مزار پر یہ شعر لکھا ہوا ہے جس سے ان کی تاریخ وفات ۱۳۲۴ھ نکلتی ہے۔

باسر قول بزرگی رازداں

خوابگاہ شیر یزدانی بخواں

نیز "محمد شاعر شیریں کلام" سے بھی تاریخ وفات نکلتی ہے۔

عرس

میاں صاحب کا عرس چار مقامات پر عقیدت و احترام کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ ۷ ذوالحجہ کو کھڑی شریف اور بجن میں اور ۱۰ اماگھ کو پھمبڑ (تحصیل و ضلع چکوال) اور ڈمنی (تحصیل کھاریاں ضلع گجرات) میں......

ملکی حالات

میاں صاحب کی شخصیت اور فکر کی تعمیر و تشکیل میں ملکی اور سیاسی حالات کو نمایاں دخل رہا ہے۔ آپ نے جس عہد میں آنکھ کھولی وہ بڑا پُر آشوب دور تھا۔ اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷ء) کی جنگ آزادی کے وقت آپ کی عمر اٹھائیس برس تھی۔

جب میاں محمد بخشؒ نے آنکھ کھولی (۳۲-۱۸۳۱ء) پنجاب اور کشمیر پر خالصہ اقتدار قائم تھا۔ کشمیر اٹھارھویں صدی کے وسط سے جس جبر و استبداد کا شکار ہوا' اس کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔ ۱۷۵۲ء میں درّانیوں نے مغلوں کی دو سو سالہ سیاسی بالادستی کا خاتمہ کر کے کشمیر پر اپنا تسلط قائم کیا۔ کشمیر کے افغان حکمران اچھا تاثر قائم کرنے میں ناکام رہے۔ ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر پر قبضہ کر کے اسے سکھ عملداری میں شامل کر لیا' سکھوں کا ۲۷ سالہ دور ظلم و ستم اور جبر و استبداد کا تاریک ترین دور تھا۔ اس دور میں کشمیریوں کی حیثیت ڈھور ڈنگروں سے زیادہ نہ تھی۔ مذہبی آزادی سلب کر لی گئی۔ سکھا شاہی کا لفظ ہی ظلم و ستم کا مترادف پا چکا تھا۔ مسجدوں میں اذان دینا بھی مشکل ہو گیا بلکہ ممنوع قرار دیا گیا۔ گاؤ کشی کی پاداش میں مسلمانوں کو زندہ جلایا گیا۔ سلطان سکندر کی جامع مسجد پر تالا پڑ گیا۔ شاہی مسجد کو گودام بنا دیا گیا۔

معاہدہ امرتسر ۱۶۔ مارچ ۱۸۴۶ء میں پچھتر لاکھ نانک شاہی روپوں کے عوض ایسٹ انڈیا کمپنی نے کشمیر کو گلاب سنگھ ڈوگرا کے حوالے کیا' اس وقت میاں محمد بخشؒ بلوغت میں قدم رکھ چکے تھے' یعنی آپ کی عمر ۱۶ سال تھی۔ ڈوگرا راج کے ساتھ ہی مسلم اکثریت پر ظلم و تشدد کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی حیثیت قلیوں اور مزدوروں کی ہو کر رہ گئی۔ سیاسی اور معاشی استحصال نے مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی۔ ظالمانہ ٹیکسوں سے ان کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا جاتا تھا۔ وہ تمام سہولتوں سے محروم کر دیئے گئے۔ اس پر ستم یہ کہ انہیں شکایت کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اگر کوئی مسلمان کسی سیاح کے سامنے اپنی حالتِ زار بیان کرتا تو اسے جیل میں ڈال دیا جاتا......

یہ مظالم میاں صاحب جیسے درد دل رکھنے والے شاعر کو بری طرح تڑپا رہے تھے۔ اس کی بے شمار مثالیں آپ کے کلام میں جا بجا موجود ہیں۔ "سیف الملوک" کی ضمنی کہانیوں میں "باشک ناگ اور

پکھیرو کی جنگ'' نیز'' شکاری اور فاختہ'' اسی قسم کے مظالم کی مثالی کہانیاں ہیں۔ اگر چہ میاں صاحب نے اپنے دور کے ظالم حکمرانوں کے خلاف کوئی منظم مہم یا کھل کر کوئی تحریک تو نہیں چلائی اور نہ ہی'' جہاد'' یا '' آزادی'' کے عنوان سے کوئی مستقل کتاب لکھی لیکن آپ کی تصانیف میں ظالم حکمرانوں اور سامراجی قوتوں کے خلاف نفرت کے واضح اشارات ملتے ہیں۔ آپ نے انہیں سنگسار اشتر سر ابوزنگی اور باشک ناگ جیسے قبیح ناموں سے یاد کیا ہے۔ علاوہ ازیں ریاست کے ڈوگرہ حکمرانوں اور ان کے گماشتوں کو بڑی جرأت مندی کے ساتھ ظلم وستم سے روکتے اور ڈانٹ پلاتے تھے۔ کسی راجے مہاراجے نے آپ کے ایک مرید کو نوکری سے نکال دیا تو آپ نے اسے لکھا۔

مان نہ کریئے راجیا سدا نہ کرسیں راج
کوئی دن ظلم کمائیکے اوڑک کھاسیں بھاج
سن لے عرض غریب دی نہ کر ایڈ مزاج
نوکر رکھ محمدؐ آج اسیں محتاج

اس چار بیتی کا آخری مصرعہ بڑا معنی خیز اور معرکتہ الارا ہے۔ راجیا! ہماری یہ بات کان کھول کر سُن لے کہ اگر آج تیرا راج ہے اور ہم محتاج ہیں تو انشاء اللہ کل ہمارا راج ہوگا اور تو محتاج۔ اس لئے غرور تکبر کو دماغ سے نکال دے اور ہمارے آدمی کو نوکری پر بحال کر دے۔

اس طرح جہاں تک آپ سے ہوسکا آپ نے اپنے دور کے بندوبست میں نئی اصلاحات میں نرمی کرائی۔ مالئے کم کرائے اور بیگاریں معاف کرائیں۔ آپ نے شاعری کے ذریعے عمل کا پیغام نشر کیا۔ ان رُوح فرسا حالات کو دیکھ کر ہی میاں صاحب نے یہ دُعا کی ہے......

رحمت دا مینہ پا خدایا باغ سُکا کر ہریا
بُوٹا آس اُمید میری دا کر دے میوے بھریا

ترجمہ:

''اے خدا! رحمت کی بارش برسا اور سُوکھا باغ ہرا بھرا کر دے۔ اور میری اُمیدوں اور آسوں کے بوٹے کو میوے بھرا کر دے۔''

یہ سوکھا باغ وہ معاشرہ ہے جس کی توانائیوں کو آکاس بیل کی طرح مہاجنی جاگیردارانہ اور آمرانہ نظام نے چوس لیا تھا اور وہ خزاں زدہ باغ کا منظر پیش کر رہا تھا۔

میاں صاحب اپنے مستقبل کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لئے جدوجہد اور عمل کا پیغام دیتے ہیں۔

مردا همّت هار نہ مُولے مت کوئی کھے نمردا
همت نال لگے جس لوڑے پائے باجھ نہ مردا

جاں جاں ساس نراس نہ ہوویں' ساس ٹُٹے مُڑ آسا
ڈھونڈ کرن تھیں ہٹیں ناہیں' ہٹ گیوں تا ہاسا
جھل جھل ہار نہ ہاریں ہمّت' ہکدن پھرسی پاسا
بھکھا منگن چڑھے' محمدؐ' اوڑک بھردا کاسا

ترجمہ:

''اے جواں ہمت انسان! کبھی ہمت نہ ہارنا' کہ کوئی تمہیں دُوں ہمت کہے۔ ہمت' عزم اور حوصلہ کے ساتھ جو کوئی کسی چیز کی تلاش کرے وہ اسے پائے بغیر نہیں مرتا۔ جب تک سانس باقی ہے' تو نا اُمید نہ ہو' شکستِ آرزو کے بعد پھر آرزو کر' تلاش و جستجو نہ چھوڑ' اگر تو اس سے ہٹ گیا تو تیری جگ ہنسائی ہوگی۔ مسلسل ہار اور بار بار شکست سے ہمت نہ ہارنا' ایک نہ ایک دن حالات پلٹا کھائیں گے۔ اے محمدؐ! اگر بھوکا مانگنے کے لئے چل نکلتا ہے تو آخر کار اس کا کاسہ بھر ہی جاتا ہے۔''

شاعری سے تعلق

پنجابی شاعری کو یہ خصوصی اعزاز حاصل ہے کہ اس کے اکثر سرکردہ سخن ور اعلیٰ درجے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عرفان و تصوّف کے بلند مدارج پر فائز رہے۔ بابا فرید گنج شکرؒ سے شروع ہونے والی روایت شاہ حسینؒ' سلطان باہوؒ' بلھے شاہ اور وارث شاہ سے چلتی ہوئی انیسویں صدی میں شمالی پنجاب میں میاں محمد بخشؒ اور جنوب میں خواجہ فرید کے ہاتھوں پروان چڑھی۔

میاں محمد بخشؒ ایک فطری اور آفاقی شاعر تھے۔ انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا اور اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھا تو شعر کہنا شروع کیا۔ ''مرزا صاحباں'' میں تحریر کرتے ہیں:

"چھیویں برس میں شعر دے وِچ عرصے گھوڑا طبع دا آن دوڑایا"

سوال شریف میں ان کے استاد حافظ ناصر صاحب نے ذوق شعر کو جلا بخشی۔ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ اپنے شاگرد سے مولانا جامی کی معروف مثنوی ''یوسف زلیخا'' باآواز بلند لحن سے سُنا کرتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ کے کلام سے آپ کی روشناسی کا آغاز ابتدائی عمر سے ہی ہو چکا تھا۔ اس مطالعے کے اثرات ان کی شاعری پر بخوبی محسوس کئے جاتے ہیں۔ بالخصوص حافظ اور مولانا روم کے اثرات۔ حافظ کے بعض اشعار کا آپ نے اتنا خوبصورت ترجمہ کیا ہے کہ اصل کی روح ترجمے میں منتقل کر دی ہے۔ اسی طرح غنیمت کنجاہی کی معروف مثنوی ''نیرنگ عشق'' کا منظوم پنجابی ترجمہ فارسی

پر ان کی قادرالکلامی کے ساتھ ساتھ اِن کے شعری ذوق کا عکاس ہے۔

اُنہوں نے اپنی شاعری کے بارے میں عموماً خاص انکساری اور عاجزی سے کام لیا ہے اور دیگر شعراء کا ذکر کرتے ہوئے اپنے بارے میں لکھا ہے:

اَگّے سخی بتیرے ہوئے شاعر چنگ چنگیرے
نِکّے وڈّے محمد بخشؒ آ میں تھیں سب اُچیرے

ترجمہ:

''مجھ سے پہلے بے شمار سخی اور بہت اچھے شاعر ہوگزرے ہیں۔اے محمد بخشؒ! یہ چھوٹے ہوں یا بڑے مجھ سے سب بلند ہیں اور میں ہی سب سے چھوٹا ہوں)۔''

سخن کسے دے ہیرے موتی' کوئی جواہر لعلاں
ہک دیوے ہک شمع محمدؐ' ہک مانند مشالاں

ترجمہ:

''کسی کے اشعار ہیرے موتیوں جیسے ہیں اور کسی کے لعل و جواہر کی طرح ہیں۔اے محمد! بعض چراغ ہیں اور بعض شمع کی طرح ہیں اور بعض مشعلوں کی مانند ہیں۔''

لیکن انہیں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد تھا۔آپ سے پہلے احمد یار مرالوی نے جو اپنے زمانے کے لاجواب شاعر تھے اپنی شاعری کے بارے میں ایک مصرعے میں یہ دعویٰ کیا۔

قلم میری نوقند وچھیرا دسدی تا گھنیرے

اس اظہارِ تفاخر پر چوٹ کرتے ہوئے میاں صاحب نے اپنی شعری صلاحیتوں کا اظہار بھی بڑے عجز سے کیا ہے۔

احمد یار خضر تھیں پائی سبزی باغ سخن دی
مینوں پیر مرے ھُن بخشی عجب بہار چمن دی
کلک میری اک ھرن ختن دا ملن نہ دے وچھیرے
ھر جنگل کستوری حُلّے چھنڈ دی جائے چوفیرے
تیز زبان قلم تھیں اگے جاوے کتنی منزل
ترکھی طبع زبانوں کیتی میرے مرشد کامل
تھونسا شعر محمدؐ والا آکھریا ھن باندا
احمد یار قبر وچ سُن سُن اُنگل ٹُک ٹُک کھاندا

(قصہ شیخ صنعاں)

ترجمہ:

"احمد یار نے خضر سے شاعری کے باغ کی شادابی پائی۔ مجھے میرے پیر نے
اب چمن کی بہار بخشی ہے۔ میرا قلم ایک کستوری والا ہرن ہے جو کسی گھوڑے کو
قریب پھٹکنے نہیں دیتا۔ یہ قلم ہر جنگل میں خوشبو چاروں طرف پھیلاتا جاتا ہے'
میری تیز زبان قلم سے بھی کئی منزل آگے ہے۔ میری طبع اور زبان کو یہ سرعت
مرشد کامل نے عطا کی ہے......"

احمد یار نے اپنی قلم کو "نوقندو چھیرا" یعنی وہ گھوڑا جس پر سواری نہ کی گئی ہو سے تشبیہ دی ہے یعنی جس طرح نوقندو چھیرا چوکڑیاں بھرتا ہے اور تیز رفتاری دکھاتا ہے اسی طرح ان کا قلم شعر لکھتے ہوئے تیز رفتار اور اَن تھک ہے۔ میاں محمد بخشؒ نے اپنی "کلک" کو ہرن ختن سے تشبیہ دی ہے کہ تیز رفتاری کے ساتھ یہ دردو سوز کی کستوری کی خوشبو سے آپ کا کلام پڑھنے والے کے دماغ میں معطر کرتی چلی جاتی ہے۔

میاں صاحب کے دوست ملک محمد لکھتے ہیں کہ جب کسی محبّ کی طرف کوئی تحریر منظور ہوتی تو عموماً منظوم ہی لکھا کرتے تھے۔ فارسی' اردو' پنجابی زبان میں بے تکلف اور سرعت سے اشعار لکھتے تھے۔ عربی زبان میں آپ کی نظم ونثر نہایت اعلیٰ پایہ کی ہوتی مگر کم اتفاق ہوتا تھا آپ کے اشعار ترانہ حقیقی کا نغمہ ہیں۔ اہل دل کو ایک ایک مصرعہ پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ ذرا توجہ کی تو بس ایک دریا ہے' جو اُمڈا چلا آ رہا ہے

اتنی قادرالکلامی کے باوجود انکساری اور خدا ترسی کی کیفیت یہ تھی کہ خود لکھتے ہیں۔

"لذت سوز نہیں وَس میرے صاحب نوں توفیقاں"

یہ مصرع خواجہ حافظؔ سے توارد معلوم ہوتا ہے۔

"قبول خاطر و لطف سخن خداداد است"

اور فی الواقع یہ لذت اور سوز باری تعالیٰ کا خاص عطیہ وانعام تھا۔

عروضی مہارت

یہاں یہ نہ سمجھا جائے کہ میاں محمد صاحب اپنے مرتبہ فن سے آگاہ نہیں ہیں۔ اُنہوں نے مختلف مقامات پر بلند مرتبہ اساتذہ کی طرح اپنی شاعری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

وزن برابر بیت بنائے، کنڈے چاھڑ عقل دے
ردی(1)، ردیفاں، قافیاں دے سنگ، جاسن مل دے رل دے

(1) قافیے کا حرف اصلی

ترجمہ:

''میں نے یہ اشعار ہر لحاظ سے مناسب وموزوں اور عقل وفکر کے ترازو میں تول کر کہے ہیں جو کہ حروف ردی، ردیفوں اور قافیوں کے ساتھ خود بخود ملتے جائیں گے۔''

صنعت بھی کچھ تھوڑی بھتی ھوسی نال طریقاں
لذت سوز نھیں وس میرے صاحب نوں توفیقاں

ترجمہ:

''میرے ان اشعار میں طریقے اور قرینے سے کچھ لفظی یا معنوی خوبیاں بھی ہوں گی۔ البتہ لذت اور سوز میرے بس کی بات نہیں ہے یہ تو سب اسی مالک کی دین ہے جسے وہ عطا کرے۔''

لیکن انصاف شرط ہے۔ میاں محمد نے ''نہیں وس میرے'' کہہ کر اپنی نیک نفسی اور خدا پرستی کا نہایت خوبصورت ثبوت دیا ہے اور مضمون بہت بلند کر دیا ہے۔

وہ اپنی شاعری کے سلسلے میں خدا سے دعا کرتے ہیں......

بال چراغ عشق دا میرا روشن کر دے سیناں
دِل دے دِیوے دی روشنائی جاوے وِچ زمیناں
لاہ ھنیرا جھل بُرے دا چانن لا عقل دا
بخش ولایت شعر سخن دی یُمن رھے وِچ رُلدا
اول دے دل جس وِچ ھوون سچّے سخن خزانے
لعل جواھر کڈھ کڈھ دیوے قوت بخش زبانے
طبع میری دا نافہ کھولیں ملکیں مشک دُھمائیں
سُن سُن مغز مُعطّر هوون بُو عشق دی پائیں
سخن میرے دی شکروں هوون مٹھے مُنه قلم دے
شعر میرے دے عطروں کاغذ لاوے خال رقم دے

ترجمہ:

''اے خدا! میرے عشق کا چراغ روشن کر کے میرا سینہ منور کر دے تا کہ میرے دل کی روشنی چاروں طرف پھیل جائے۔ میری جہالت کا اندھیرا دور کر دے اور مجھے عقل کی روشنی عنایت کر۔ مجھے شعر وسخن کی ایسی ولایت بخش دے جس کے آگے موتی بھی ہیچ ہو جائیں۔ پہلے مجھے ایسا دل عطا کر جس میں سچے کلام کے خزانے ہوں۔ میری زبان کو ایسی قوت دے کہ وہ دل کے اس خزانے سے لعل و جواہر نکال کر لائے۔ میری طبع رسا کا نافہ اس طرح کھول دے کہ اس کے مشک

کی دنیا میں دھوم پڑ جائے۔ میرے اشعار جو بھی سُنے اس کا دماغ معطر ہو جائے
اور اس میں عشق کی خوشبو پیدا ہو۔ میرے کلام کی شکر (مٹھاس) سے قلم کا منہ
میٹھا ہو۔ اور میرے اشعار کے عطر سے کاغذ پر خال رقم ہوں۔۔"

ان دعائیہ اشعار ہی سے میاں محمد بخشؒ کی صوفیانہ طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دراصل یہ ان کا عجز ہے' ورنہ جہاں تک علم کا تعلق ہے وہ اس میں بہت سے شاعروں سے بلند نظر آتے ہیں۔ دینی اور روحانی علوم کے ساتھ ساتھ ان کا تاریخی مطالعہ بہت وسیع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سیف الملوک میں انہوں نے جہاں مختلف رزمیہ اور عشقیہ داستانوں کے حوالے دیئے ہیں وہاں وہ گذشتہ تاریخ کے بعض مثالی کرداروں سے بھی پوری طرح آگاہی رکھتے ہیں۔

خلوص' جذبہ اور سادگی اظہار کی جو روایت پنجابی شاعری میں جاری تھی میاں محمد بخشؒ نے اس کو نقطۂ عروج تک پہنچا دیا۔

"سیف الملوک" کے ابتدائی اوراق میں فرماتے ہیں:......

جو شاعر بے پیڑا ہووے سُخن اوھدے وی رُکھے
بے پیڑے تھیں شعر نہ ھوندا اگ بن دُھوں نہ دُکھے
ویکھو ویکھی شعر بناون شعروں خبر نہ پاون
ایس طرح تے صفتاں سٹھاں بھتے ڈوم بناون
سخن بھلا جو دردوں بھریا بن دردوں کجھ نائیں
نڑاں کماداں فرق رھو دا کیا کانے کیا کاھیں
درد منداں دے سخن محمدؐ دیھن گواھی حالوں
جس پلّے پُھل بدّھے ھون آوے بُوروما لوں

ترجمہ:

"فرماتے ہیں کہ جو شاعر دل دردآشنا نہ رکھتا ہو اُس کے اشعار بھی پھیکے ہوں گے۔ شعر دھوئیں کی مانند ہے جو سوزِ دردوں کی آگ سے اُٹھتا ہے جو شاعر آتش عشق میں جل کر بھسم نہ ہوا ہو وہ اچھا شعر نہیں کہہ سکتا۔ ویسے تو لوگ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی تکیں جوڑتے رہتے تھے لیکن یہ تک بندی ہے شاعری نہیں ہے۔ اعلیٰ پائے کی شاعری دکھ درد سے جنم لیتی ہے۔ اس میں اور رسمی روایتی تک بندی میں وہی فرق ہے جو گنے اور سرکنڈے میں ہوتا ہے۔ یعنی گنے میں میٹھا رس ہوتا ہے جبکہ سرکنڈا اور نرکل روکھا پھیکا اور کھوکھلا ہوتا ہے۔ اہل درد کا کلام خیالی نہیں ہوتا عالی ہوتا ہے' رومال میں پھول باندھ کر رکھے جائیں تو وہ

ان کی باس سے معطر ہو جاتا ہے۔اسی طرح گویا شعر میں دردمندی سے تاثیر کی خوشبو پیدا ہوتی ہے۔"

میاں محمد بخشؒ نے ان اشعار میں سچی شاعری کا معیار ہی قائم نہیں کیا بلکہ ایک گہری نفسیاتی حقیقت کی طرف توجہ بھی دلائی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان مصائب و آلام کی بھٹی میں کندن بن کر نکلتا ہے۔ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

نھاتا ندی غماں دی اندر پاك هویا هر عیبوں

دکھ درد کے جھیلنے سے آدمی کے جذبہ و احساس میں اثر پذیر اور قبولیت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اُس کی فکر و نظر کی جلا بھی ہوتی ہے۔ایک دانشمند کا قول ہے کہ انسان کو دو چیزیں دانش و خرد بخشتی ہیں...... تنہائی اور دُکھ...... جو لوگ دکھ درد سے دوچار نہیں ہوتے اُن میں نہ تفکر کا مادہ ہوتا ہے اور نہ وہ ہمدردی انسانی کے جذبے سے آشنا ہوتے ہیں۔ایسے لوگوں کی نگاہ سطحی اور دل کٹھور ہوتے ہیں۔وہ اپنی زندگی کے مقصد اور کائنات میں انسان کے مقام سے بے خبر رہتے ہیں اور کیڑے مکوڑوں کی طرح چار دن اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کر کے ایک دن اُنہی کی طرح لیٹ کر دم توڑ دیتے ہیں۔مصائب کا سامنا کرنے سے انسان کے مخفی جوہر اُبھر آتے ہیں اور اُس میں مردانگی اور شہامت کی صفات اُبھر آتی ہیں۔

میاں محمد بخشؒ کے بقول 'بے پیڑا' شاعر یا فنکار عظمت کی بلندیوں کو نہیں چھو سکتا' نہ انسان دوستی کے نصب العین سے آشنا ہو سکتا ہے۔جس شخص نے خود مصائب کا سامنا نہ کیا ہو اسے عوام کے مصائب و آلام کا شعور و وقوف کیسے ہوگا۔مسلسل آرام و آسائش کی زندگی انسان کو بے حسی اور بیوقوفی میں مبتلا کر دیتی ہے اور اُس کے جوہر ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔اس نوع کے لوگ تک بند تو ہو سکتے ہیں' عظیم شاعر نہیں بن سکتے...... وہ میاں محمد بخشؒ کے بقول دوسروں کی دیکھا دیکھی تک بندی کرتے رہتے ہیں' جیسے میراثی اُلٹی سیدھی "صفتاں سفتاں" گھڑتے رہتے ہیں۔

اگرچہ وہ فن اور علم کے سلسلے میں بار بار اپنے عجز کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ اپنی علمی حیثیت سے بھی بے خبر نہیں۔اگرچہ درویشی نے انہیں تعلّی کی حد تک نہیں جانے دیا۔مگر اس کے باوجود انہوں نے اپنی شاعرانہ اور فنکارانہ حیثیت کو قطعی طور پر فراموش بھی نہیں کیا بلکہ اس کا اظہار بھی کیا ہے۔وہ کتاب کے آخر میں "در شکایت ظلم زمانہ بطریق عاشقانہ" کے عنوان کے تحت تحریر کرتے ہیں۔

نالے ہور نشانی میری مَعَلّم ہوندی ظاہر
وزن حساب نظم دے وِچّوں نام نہ ہوسی باہر
مصرعے اندر جڑیا ہوسی جیوں تھیوا وچ چھاپے
جے کوئی ڈوھنگی نظرے دیکھے بیتوں بیت سیہاپے

ترجمہ:

''میرے کلام سے میری ایک اور نشانی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ میرے اشعار وزن اور عروض سے باہر نہیں ہوں گے۔ (اگر کوئی غور سے میرے کلام کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ) میرے مصرعے اس طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں جیسے انگشتری میں نگینہ ہوتا ہے۔''

اسی طرح ایک اور جگہ'' سخنے چند در خاتمہ کتاب ومناجات می گوید'' کے زیر عنوان وہ اپنی شاعری اور فن کے بارے میں فرماتے ہیں:

قافیاں دے فکر اندر سی دل چنتا وِچ جُھردا
کم لمّا تے پتہ نہ کوئی موت نقارہ کھردا
وزن برابر بیت بنائے کنڈھے چاھڑ عقل دے
ردی ردیفاں قافیاں سنگ جاسن ملدے رَلدے

ترجمہ:

'' قافیوں کی تلاش کے فکر میں میرا دل پریشان تھا۔ کیونکہ یہ کام طویل تھا اور موت کا نقارہ ہر دم بج رہا ہے۔ پھر بھی میں نے عقل کے ترازو میں تول کے ایسے اشعار لکھے جو وزن میں پورے ہیں ان میں حرف روی اور قافیئے ایک دوسرے سے ملتے جلتے یعنی ہم آواز ہیں''

گویا وہ حلم اور علم کے ساتھ ساتھ شاعری کی فنی خوبیوں سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ اُنہوں نے اپنی ان خوبیوں کو اپنی کتاب میں استعمال بھی کیا ہے اور اس طرح ان کی علمی قابلیت اور فنی مہارت سے یہ شاہکار تصنیف ہوا......

ناقدری کا گِلہ

دنیا کے دوسرے بڑے فنکاروں کی طرح میاں محمد بخشؒ کو بھی اس بات کا افسوس اور گلہ رہا کہ زندگی میں ان کے فن کی وہ قدر نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے تھی۔ اس سلسلے میں انہیں لوگوں کی بدمذاقی کی شکایت بھی کی ہے۔

شعر میرے اس ملك آپنے وِچ مول نہ پاندے قیمت
دور دراڈے جس نوں لبھن جانے بہت غنیمت
پستہ تے بادام محمدؐ سستے مِلن پشوروں

کیسر سستا ھے کشمیرے پچھو مل لاھوروں

ترجمہ:

''میرے اشعار کی اپنے ملک میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ البتہ جب یہ دور دراز رہنے والوں کو مل جاتے ہیں تو وہ انہیں غنیمت سمجھتے ہیں یعنی قدر کرتے ہیں۔ اے محمدؐ! پشاور میں پستہ اور بادام سستے ہیں۔ اسی طرح میرے کلام کی بھی اپنے وطن میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ کشمیر میں کیسر سستا ہوتا ہے (وہاں اسے کوئی نہیں پوچھتا) اس کی صحیح قدر و قیمت جاننی ہو تو لاہور جا کر پوچھو۔''

ایک اور جگہ وہ زمانے کی بے قدری کا گلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

مر مراک بناون شیشہ' مار وَٹّا اِک بھن دے
دنیا اُتے تھوڑے رھندے قدر شناس سُخن دے
اول تے کجھ شوق نہ کسے کون سخن اج سُن دا
جے سُنسی تاں قِصّہ اُتلا کوئی نہ رمزاں پُن دا

ترجمہ:

''ایک وہ لوگ ہیں جو بڑی محنت اور مشکل سے آئینہ بناتے ہیں اور ایک وہ ہیں جو پتھر مار کے اسے توڑ دیتے ہیں۔ دنیا میں شاعری کے قدر شناس بہت کم ہیں۔ اول تو کسی کو شوق ہی نہیں جو وہ آج کلام (شاعری) سُنے۔ اور اگر کوئی سنے گا بھی تو سرسری سا سُن لے گا' اور اس کی رمز اور حقیقت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔''

وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لیتے ہیں:

عاماں بے اخلاصاں اندر خاصاں دی گل کرنی
مِٹھی کِھیر پکا محمدؐ کُتیاں آگے دھرنی

ترجمہ:

''اے محمدؐ عام اور بے اخلاص لوگوں کے سامنے عقل مندوں کی بات کرنا بالکل اس طرح ہے جیسے میٹھی کھیر پکا کر کتوں کے آگے رکھی جائے۔''

دل کی بات

ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ ضرور پیش آیا ہے جس نے انہیں یہ عشقیہ

داستان نظم کرنے پر مجبور کر دیا ہو۔ وہ ''سیف الملوک'' میں جگہ جگہ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں ان کی اپنی زندگی چھپی ہوئی ہے۔ وہ سیف الملوک اور بدیع الجمال کی کہانی بیان کرتے کرتے اکثر مقامات پر جذباتی رو میں بہہ جاتے ہیں اور اپنے اس دُکھ کو کریدنے لگتے ہیں جو ان کے سینے میں چھپا ہوا ہے۔ پھر وہ لکھتے لکھتے چونک سے جاتے ہیں اور اپنے آپ کو اصل قصّے کی طرف موڑنے کی کوشش میں کہہ اُٹھتے ہیں۔

کدھر رہیا گھاٹ محمد کدھر آئیوں ترکے
قصہ سدّھا صاف سُنائیں خوب سنبھالا کرکے
اینہاں گلّاں وڑیاں اندر قصّہ ہے ٹٹ جاندا
سدّھی صاف محمد بخشاؔ چلیں بات سناندا

ترجمہ:

''اے محمد! گھاٹ کہاں رہ گیا اور تو تیرتا ہوا کہاں آ نکلا ہے' ذرا سنبھل کے قصّہ صاف اور سیدھا سناتا جا۔ ان باتوں میں پڑ کر قصّے کا تسلسل (ربط) ٹوٹ جاتا ہے۔ اے محمد بخشؒ! تو بات سیدھی اور صاف سناتا جا۔''

اسی طرح اور بھی کئی جگہوں پر ان کے احساسات کا یہی انداز رہتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ مجبور یا بے اختیار ہو جاتے ہیں' اور سیف الملوک کا مجازی قصہ بیان کرتے ہوئے اس حقیقی قصّے کی طرف آ جاتے ہیں جو ان کے سینے میں چھپا ہوا ہے۔ ان کے احساس میں رچی بسی یہ کیفیت بار بار انہیں اصل قصے سے بھٹکا دیتی ہے۔

وقت پچھان نہ چھیڑ محمد گل پیارے والی
مت ایہہ قصّہ رہے لباں تے دیوے درد اُبالی
درد آپنے دی چھڑی کہانی روویں پیا محمدؔ
صاعدؔ بدرہؔ کھلے اُڈیکن کِت ول گیا محمدؔ

ترجمہ:

''اے محمد! وقت کو پہچان اور اپنے پیارے (محبوب) کی بات مت چھیڑ (ذکر نہ کر) کہیں ایسا نہ ہو یہ قصہ لبوں پر ادھورا ہی رہ جائے اور درد کا جوش بڑھ جائے۔ اے محمد! تو اپنے درد کی کہانی چھیڑ کر رو رہا ہے' دوسری طرف صاعد اور بدرہ کھڑے انتظار کر رہے ہیں کہ محمد (ہمیں چھوڑ کر) کہاں چلا گیا.....''

صاعدؔ اور بدرہ داستان کے دو کردار ہیں۔ ان کا میاں محمد کی زندگی سے تو واسطہ نہیں ہے لیکن اس شعر کی

کیفیت کسی چھپے ہوئے احساس کی غمازی کررہی ہے ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں

بھید چھپاویں مطلب پاویں اس گلی کس لائیوں

کدھر رھی اے گل پری دی کت پاسے اُٹھ آئیوں

ترجمہ:

''اگر تو اپنے دل کا بھید چھپائے گا تو پھر اپنا مقصد ضرور حاصل کرلے گا' یہ تو کس گلی میں آ گیا ہے' یعنی تو کن باتوں میں لگ گیا ہے۔

پری کی بات کہاں رہ گئی ہے اور تو کہاں چلا آیا ہے؟ (اصل قصہ کو چھوڑ کر کسی اور طرف متوجہ ہو گیا ہے)۔

اسی طرح وہ اپنے دل کی بات کہہ ضرور جاتے ہیں لیکن ہر جگہ اس پر کبھی داستان کا سہارا لے لیتے ہیں' کبھی الفاظ کا چکر دیتے ہیں اور کبھی وہ معانی کے مطلب کہیں اور ملا دیتے ہیں' وہ مولانا رومی کی طرح ''سر دلبراں'' کے سلسلے میں ''گفتہ آید در حدیث دیگراں'' کے قائل نظر آتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں

عاشق دی معشوقاں اگے چوری عرض پچایئے

باھجھ پیا تھیں بھید سجن دا ھوراں نھیں سُنایئے

ترجمہ:

''عاشق کی بات معشوقوں کے سامنے چوری سے یعنی چھپا کے بیان کرنی چاہئے۔ کیونکہ اپنے ساجن کا بھید اس کے سوا کسی اور کو سُنانا نہیں کہنا چاہئے۔''

اسی بات کو وہ یوں بیان کرتا ہے

اپنے دُکھ محمد بخشؒا جے توں پھولن لگوں

قصہ ھك بنے گا ایھو بیٹھ صبر کر اگوں

کس نوں گن گن دکھ سناسیں کس نوں پیڑ اساڈی

مڑ کے دس شاھزادے والی رھیا گل دوراڈی

ترجمہ:

''اے محمد بخشؒ! اگر تو اپنے دکھ بیان کرنے لگ گیا' تو یہ ایک الگ قصہ بن جائے گا۔ اس لئے صبر کرو اور خاموش ہو جاؤ۔ تم کس کس کو اپنے دکھ سناؤ گے؟ اور کس کو ہمارا دکھ ہوگا؟ ان باتوں کو چھوڑو اور شاہزادے کے بات سناؤ جو بہت دور رہ گئی ہے۔''

جے سو پھولن غم دے پھولاں ورقاں داغ لگاواں

دردمنداں دے درد نہ مکدے جے لکھ گاون گاواں

ترجمہ:

''اگر میں اپنے دکھ کے زخم کریدنے لگوں اور بے شمار اوراق سیاہ کر دوں تو پھر بھی دکھیا لوگوں کے غم بیان نہ ہو سکیں گے خواہ میں لاکھ غم کے گیت گا تا رہوں۔''

وہ اپنے دل کی حقیقت پر سیف الملوک کے ہجر و فراق کا مجازی پردہ ڈال دیتے ہیں۔ مگر یہ پردہ کب تک؟ یہاں محمد بخشؒ پوری کوشش کے باوجود اپنے دل بات کو چھپا نہ سکے اور آخر ایک مقام پر بے اختیار ہو کر حجاب کی ساری پابندیاں اُٹھا دیتے ہیں اور سیف الملوک کے ہجر و فراق کا جو مجازی پردہ اپنے دل کی حقیقت پر ڈالا ہوا تھا' اس کو چاک کر دیتے ہیں اور دل کی قلعی یوں کھولتے ہیں۔

ذکر سجن دا چھوڑ نہ سکاں وَس نہیں کجھ میرے
پر شہزادے دی گل محمدؐ رہ گئی دور پریرے

ترجمہ:

''میں اپنے ساجن کا ذکر نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ بات میرے بس میں نہیں ہے' لیکن اے محمد! شہزادے کی بات تو کہیں دور پیچھے رہ گئی ہے۔''

اس سے بات یقینی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ میاں محمد بخشؒ نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے' وہ ان کی اپنی زندگی کا کوئی دکھ یا کوئی جذبہ ہے' ان کا اپنا کوئی احساس ہے۔ اسی جذبہ اور احساس نے انہیں سیف الملوک اور بدیع الجمال کے عشق کی داستان کو نظم کرنے پر مجبور کیا۔

میاں محمد بخشؒ اپنے دلی جذبات کی یوں عکاسی کرتے ہیں......

باغ بہاراں تے گلزاراں بن یاراں کس کاری
یار ملے دکھ جان ہزاراں شکر کراں لکھ واری
اُچی جائی نئیوں لگایا بنی مصیبت بھاری
یاراں باجھ محمد بخشا کون کرے غم خواری

ترجمہ:

''باغوں کی بہاریں اور گلزاروں کی مہک دوستوں کے بغیر کس کام کی ہیں۔ اگر میرا دوست مل جائے تو ہزاروں دکھ درد دور ہو جائیں اور میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کروں...... میں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر اونچی جگہ تعلق پیدا کر لیا ہے۔ اب میری جان سخت مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ اے محمد بخشؒ! دوستوں کے سوا کون میری غم خواری کر سکتا ہے۔''

لیکن حقیقت حال یہ ہے۔

غم بھتے غم خوار نہ کوئی گن گن دساں کینوں
جس دے پیچھے جرم گوایا مکھ نہ دسیوس مینوں
جسے کجھ باب میرے دکھ کر دے ھے کی خبر کسے نوں
سوئیو جانے قدر محمد تن من لگ وے جھنوں

ترجمہ:

''میرے گردغموں نے گھیراڈالا ہوا ہے لیکن میراغم خوار کوئی نہیں ہے۔ میں اپنے دکھ کس کو گن گن کر بتاؤں؟ میں نے جس کی خاطر اپنی زندگی برباد کرلی ہے اس نے مجھے اپنا چہرہ تک نہیں دکھایا۔ اس کی جدائی میں دکھ اور درد جو میرے ساتھ سلوک کر رہے ہیں' اس کی خبر کسی کو کیا ہو سکتی ہے؟ اے محمدؐ! اس کی قدر وہی جانتا ہے جس کے تن من میں لگی ہوئی ہو۔''

میاں محمد بخشؒ انتہائی حسرت اور یاس کے عالم میں اپنے نادیدہ محبوب کو یاد کر کے روتے ہیں کہ اب محبوب کی یاد میں میری حرز جاں بن گئی ہے۔ میں اس کو کسی صورت اپنے دل سے بھلا نہیں سکوں گا۔

ڈٹھے باجھ پریت لگائی ہو گیا جس ہونا
ھسن کھیڈن یاد نہ مینوں پیا عمروا رونا
دلبر مکھ دکھاندا ناھیں' داغ میرا کس دھونا
ساجن دا در چھوڑ محمدؐ کس در جا کھلونا

ترجمہ:

''میں نے بن دیکھے ہی پیار کرلیا ہے اور جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ہے' مجھے ہنسنا کھیلنا سب کچھ بھول گیا ہے اور ساری عمر کا رونا قسمت میں لکھا گیا ہے۔ میرا محبوب مجھے اپنا چہرہ دکھاتا نہیں تو پھر کون میرے غم کا داغ دھوئے گا۔ اے محمدؐ! اب میں اپنے محبوب کا دروازہ چھوڑ کر کہاں جاؤں'' ...... اگرچہ اس قسم کے دوہے میاں محمد بخشؒ نے اس وقت لکھے ہیں۔ جب شہزادہ سیف الملوک بدیع الجمال کے فراق میں بے تاب ہو جاتا ہے' لیکن اس سے ان کی اپنی کیفیت کی غمازی ہو رہی ہے۔''

گہرے مشاہدۂ فطرت اور خلقِ خدا کی خدمت کے بے پناہ جذبے کے علاوہ میاں صاحب کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کا رفقاء کے لئے پیار و محبت کا انمٹ جذبہ ہے۔ میاں صاحب کا جس سے بھی تعلق قائم ہوا' اُسے آپ نے اپنے دل کی گہرائیوں میں جگہ دی۔ شاید اس کی نفسیاتی وجہ ان کی خود محبت اور شفقت سے محرومی اور اہل و عیال کا نہ ہونا تھا۔ کہیں کہیں اس محرومی کی ہلکی سی جھلک ان کے کلام

میں نظر آتی ہے۔ ـ

کی کجھ لاڈ پیار مانواں دے کی کجھ آکھ سُناواں
جے اج ماں ہوندی رو مردی کِیہ پرواہ بھراواں
جے اج مائی بابل میرے دُنیا اُتے ہوندے
خستہ حالی دیکھ پتر دی سُکھ نہ سوندے روندے
ھك انھاں دا لال پیارا خاك اندر رُل سُتّا
دُوجا کنبدا لگدا پھردا جیوں کر پانْول کُتّا
تریجے نوں رب بھاگ لگائے لکھاں شکر خدا دے
دولت عمر اقبال اسے دے دن دن ہون زیادے
ترلے کر کر لدھے آھے خوشیاں کر کر پالے
ھالے ھالے اَج نہیں آ تکدے ماپے جننے والے
جے میں اَج ٹُراں پردیس سے کوھاں دے جاواں
کیہڑا پچھیوں کرے دُعائیں رو رو وانگن مانواں!

ترجمہ:

''مائیں کیا کیا لاڈ پیار کرتی ہیں یہ بات میں کس طرح بتاؤں؟ اگر آج ماں ہوتی تو وہ رو رو کر مر جاتی۔ بھائیوں کو کیا پرواہ ہے۔ اگر آج میرے ماں باپ زندہ ہوتے تو بیٹے کی خستہ حالی دیکھ کر ان کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ (وہ سکھ کی نیند نہ سوتے) ان کا ایک پیارا بیٹا خاک تلے سویا ہوا ہے۔ اور دوسرا ایک پاگل (یا خارش زدہ) کتے کی مانند کانپتا اِدھر اُدھر بھاگا پھرتا ہے۔ تیسرے کو خدا نے عزت اور اقبال بخشا ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ اس کی عمر دولت اور اقبال میں خدا روز بروز اضافہ فرمائے۔ بڑی التجاؤں کے بعد وہ ملے تھے۔ اور بڑی خوشیوں سے ماں باپ نے پالا تھا۔ اگر میں آج پردیس جاؤں اور کئی کوسوں کا فاصلہ طے کر جاؤں تو کون ماں کی طرح رو رو کر میرے لئے دعائیں مانگے گا۔''

اس جذباتی خلاء کی میاں صاحب کے کلام میں ایک اور مقام پر بھی نشاندہی ہوتی ہے......

کون بندے نوں یاد کریسی ڈھونڈے کون قبر نوں
کس نوں درد اساڈا ھوسی روگ نہ رنڈے ورنوں
روح درُود گھنن سب جاسن آہو اپنے گھر نوں

تیرا رُوح محمدؔ بخشا تکسی کیھڑے دَر نوں
ناں گھر چاھڑے ناں سُکھ ڈٹھے ناں کجھ کھٹی کھٹی
نہیں کسے ول لھنا کوئی' نہ چھڈ چلے ترٹی
جے کُجھ آیا سو مُنہ پایا تلی رکابی چٹی
خالی ھتھ' محمدؔ بخشا ٹُری نِکاری لٹی
اُنس اولاد تساڈی بھائی پڑھسن بیٹھ قبر تے
آٹھویں روز دیون گے گُلیّ' جے کجھ گھر وچہ ورتے
مینوں ہور نہیں کوئی پاسا آسا کس دے گھرتے
جاسی رُوح' محمدؔ میرا پیر سچے دے دَر تے

ترجمہ:

''مجھ عاجز بندے کو کون یاد کرے گا۔ اور کون میری قبر کو ڈھونڈے گا۔ میرا درد کس کو ہوگا' کیونکہ رنڈوے کا کسی کو بھی درد نہیں ہوتا۔ تمام روح اپنے اپنے گھر دُرود لینے جائیں گے۔ لیکن اے محمدؔ تیرا رُوح کس دروازے کا رُخ کرے گا؟ نہ میں نے گھر بنائے نہ میں نے سکھ دیکھا۔ نہ کچھ کمایا۔ نہ کسی سے مجھے کچھ لینا ہے اور نہ میں کچھ چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ جو کچھ ملا اسے کھالیا' کچھ جمع نہ کیا۔ اور اس جہان سے خالی ہاتھ ہی چلا گیا۔
اے بھائی! تمہاری اولاد تمہاری قبر پر بیٹھ کر فاتحہ خوانی کرے گی اور جو کچھ گھر میں ہوگا۔ آٹھویں روز بطور خیرات دیں گے۔
مجھے اور کوئی سہارا اور اُمید نہیں۔ اے محمدؔ میرا رُوح سچے پیر کے در پر جائے گا۔''

تو وہ اپنی شاعری کو بھی مرشد کی عطا کردہ سمجھتے ہیں:......

کسے کسے تھیں کسے کسے تھیں کسے خضرؑ الیاسوںؑ
شعر کلام سخن دی بخشش مینوں مرشد پاسوں

یہ احساس محرومی اور جذباتی خلاء ان کے کلام میں سوز و گداز کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اور اسی نے ذاتِ خداوندی اور مخلوقِ خدا سے پیار کی راہ دکھائی ہے۔

لا پریت محمدؔ جس تھیں جگ وچ رھے کھانی

ترجمہ:

''(اے محمدؔ ایسی پریت لگا کہ جگ (دنیا) میں تیری کہانی ہمیشہ رہے)......''

احباب کے لئے میاں صاحب کی محبت' الفت' گرم جوشی کے مظہران کے مالک محمد صاحب کے نام

متعدد خطوط ہیں۔ گرمیٔ جذبات اور رفاقت کی خوشبو ان خطوط کے میں رچی بسی ہوئی ہے۔

حب وطن

میاں محمد بخشؒ کے بعض اشعار سے وطن سے پیار کے جذبے کا شدید اظہار ہوتا ہے۔ وہ اس مٹی سے پیار کرتے ہیں جہاں وہ پیدا ہوئے' بچپن بیتا' جوان ہوئے اور زندگی کے ایام بسر کیے۔ وہ اپنے وطن کی گدائی کو پردیس کی بادشاہی سے بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان دو اشعار میں اس احساس کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔

تـوڑے کتّـے بـن کـے رہیئـے وِچ وطـن دیـا گـلیـاں
دَر دَر جھـڑکاں سہیئے تاں بھی پردیساں توں بھلیاں
اپـنـے مـلك دے کـلّـر انـدر تُـمّـے چُـن چُـن کـھـایـئـے
غیـر مُـلك دے بــاغــاں انــدر میـوے کـھـان نـہ جـایئے

ترجمہ:

"اگرچہ اپنے وطن کی گلیوں میں کتوں کی طرح بھی رہنا پڑے' در در کی جھڑکیں برداشت کرنی پڑیں' پھر بھی پردیس سے اچھی ہوتی ہیں...... اپنے ملک کی سیم زدہ زمین سے تمے (کڑوا پھل) کھانے پڑیں تو وہ غیر ممالک کے باغات کے میٹھے اور لذیذ پھلوں سے بہتر ہیں۔"

انکسارِ خود و مدحِ شعرا

میاں صاحب میں یہ خاص خوبی ہے کہ اپنی ذات کو ہر لحاظ سے منکسر ظاہر کرتے ہیں اور دوسرے شعراء کو ایک ایک کر کے نہایت احترام وعقیدت سے یاد کرتے ہیں۔ یہ بزرگی کی واضح اور عظیم علامت ہے۔ انہوں نے پنجابی شاعری کا تنقیدی محاکمہ پیش کیا ہے۔ یہ محاکمہ ان کے وسیع مطالعے کے علاوہ ان کے شعری ذوق کا بھی آئینہ دار ہے۔

شــاعـر نــام دھـراون لائـق قـدر نہیں کجـھ میرا
اُہ کھیتـاں دے سـائیـں میـرا کـھـال بـنّـے پر پھیرا

ترجمہ:

"میں تو اس قابل بھی نہیں ہوں کہ اپنا نام شاعر رکھوں' یعنی شاعر کہلواؤں۔ بڑے شاعر تو کھیتوں کے مالک تھے اور میں تو کھال اور کھیتوں کے کنارے ہی پھرتا ہوں۔"

خشخش جتنا قدر نہ میرا اس نوں سب وڈیایاں
میں گلیاں دا رُوڑا کُوڑا محل چڑھایا سایاں

ترجمہ:

''میری حیثیت تو خشخاش کے دانے کے برابر بھی نہیں ہے اور ساری عزت و آبرو اسی کے لئے ہے۔ میں تو گلیوں کا کوڑا کرکٹ ہوں اور مجھے مالک نے محل تک پہنچادیا ہے ورنہ میں کیا اور میری حیثیت کیا ہے؟''

پنجابی شعراء کا ذکر

پنجابی کے اکثر اور فارسی کے بعض شاعروں کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ ان میں سے چند ایک کا ذکر ملاحظہ فرمائیے......

اوّل شیخ فرید شکر گنج عارف اهلِ ولایت
هك هك سُخن زبان اوهدی دا رهبر راه هدایت
پهر سلطان باهو هك هویا خاصه مرد حقانی
دوهڑے پاك زبان اوهدی دے روشن دو هیں جهانی
بلهے شاه دی کافی سُن کے ترٹدا کفر اندر دا
وحدت دے دریا دے اندر اوه بهی وتیا تردا
وارث شاه سخن دا وارث نندے کون اُنهاں نوں
حرف اوهدے تے انگل دهرنی ناهیں قدرا سانوں
جیهڑی اوس چوهڑیٹی آکهی جے سمجهے کوئی ساری
هك هك سخن اندر خوشبوئیں وانگ پهلاں دی کهاری
شاه مراد جنّے دے کتهے سخن مراداں والے
محبوباں دے جهنڈ لهاون واه مستاں دے چالے
مقبل دی گل ستهی سادی هے مقبول پیاری
لفظ کمیں تے معنی بهتے یاد رکهن دی کاری
رانجها برخوردار سنیندا بُلبُل باغ سخن دی
شعر اوهدا جیوں وائو فجر دی آنے باس چمن دی

کوئی کوئی بیت پرانا کدھرے سنیاں شاہ فضل دا
پر اوہ بھی کوئی دکھیں بھریا بولے جلدا بلدا

ترجمہ:

''پہلا شاعر شیخ فرید شکر گنج جو عارف اور اہلِ ولایت ہے۔ اس کی شاعری کا ایک ایک لفظ رہبرِ راہ ہدایت ہے۔ پھر سلطان باہو ایک شاعر ہوا ہے' جو مرد حقانی تھا۔ اس کی زبانِ پاک سے نکلے ہوئے دوہڑے دونوں جہانوں میں شامل ہیں۔ بلھے شاہ کی کافی سن کر اندر کا کفر ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ بھی وحدت کے دریا کے اندر تیر تا رہا ہے وارث شاہ سخن (شاعری) کا وارث ہے ان پر حرف گیری کی جرأت کون کرسکتا ہے۔ اس کے کسی لفظ پر اعتراض کرنے کی ہمیں ہمت نہیں۔ اس نے جو ''چوہڑیٹی'' لکھی ہے۔ اس کے ایک ایک لفظ کے اندر پھولوں کی ٹوکری کے مانند خوشبو بھری ہوئی ہے۔ شاہ مراد جو ان کے سخن بھی بڑے مرادوں والے ہیں۔ واہ! مست و بے خود کے کیا طور طریقے ہوتے ہیں کہ جو محبوبوں کے گھونگھٹ اتروا دیتے ہیں۔ (بے نقاب کر دیتے ہیں) مقبل کی باتیں سیدھی سادی اور پیاری پیاری ہیں۔ اس کے لفظ کم ہیں لیکن معانی زیادہ ہیں اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ رانجھا برخوردار کو باغِ سخن کی بلبل کہا جاتا ہے۔ اس کا شعر صبح کی ہوا کی مانند چمن کی خوشبو لاتا ہے۔''

میں نے کوئی پرانا شعر کہیں فضل شاہ کا بھی سُنا ہے لیکن وہ بھی کوئی بڑا دُکھ بھرا اور جلتا ہوا شعر کہتا ہے (دردو سوز سے بھرپور)

ھاشم شاہ دی حشمت برکت گنتر وچ نہ آوے
دُرّ یتیم جواھر لڑیاں ظاھر کڈھ لٹاوے

ترجمہ:

''ہاشم شاہ کی حشمت و برکت کوئی شمار میں نہیں آتی۔ یعنی وہ بہت بڑے اور بزرگ شاعر ہو گزرے ہیں وہ ایسے شاعر جو شعروں کی بجائے لعل و جواہرات کی لڑیاں نکال کر لٹاتے ہیں۔''

اسی طرح چالیس سے زیادہ صرف پنجابی شاعروں کے متعلق احترام و عقیدت کے جذبات منظوم کئے ہیں۔ اس سے میاں محمد صاحب کی شرافت' اخلاقی عظمت اور وسعت مطالعہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اعلیٰ' اوسط اور ادنیٰ درجے کے سبھی شعراء کا ذکر کیا ہے۔ لیکن کسی کے متعلق کوئی ناخوشگوار کلمہ زبانِ قلم سے نہیں نکالا۔ ہاشم شاہ کی ''شیریں فرہاد'' پر تاریخی لحاظ سے نکتہ چینی کی ہے لیکن اس میں احترام و عقیدت کا دامن

ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔فرماتے ہیں کہ شیخ نظامی گنجوی اور امیر خسرو نے ''شیریں فرہاد'' کے متعلق جو باتیں بیان کی ہیں' ہاشم نے ان سے انحراف کیا ہے اور سُنی سُنائی باتوں پر اپنے قصّے کی بنیاد رکھی ہے۔اس کے ساتھ ہی حسنِ ظن کو قائم رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔شاید یہ کوئی اور ہاشم ہو یا اگر وہی معروف ہاشم شاہ ہے تو اس کو اصل حالات معلوم نہ ہو سکے ہوں۔تاہم مناسب یہی تھا کہ تحقیقِ حال کے بعد داستان منظور کرتا! کچھ بھی ہو ہم پر متقدمین کا احترام واجب ہے کیونکہ جو کچھ اسے معلوم ہوا' اس نے نظم کر دیا۔ہم اس پر عیب نہیں لگا سکتے۔بحیثیت شعر اس میں کوئی عیب نہیں......

یہی مفہوم شاعر کے اپنے لفظوں میں ملاحظہ فرمایئے۔پہلے ہاشم شاہ کی تعریف کرتے ہیں......

مختصر کلام اوہناں دی دردوں بُجھی بوٹی
درد ہویا تاں سب کجھ ہویا کیا لمّی کیا چھوٹی

ترجمہ:

''اگر چہ انہوں نے نہایت مختصر کلام لکھا ہے لیکن وہ درد کی بھونی ہوئی بوٹی ہے اگر شاعر کے کلام میں درد ہو تو پھر سبھی کچھ ہوتا ہے' کیا مختصر اور کیا لمبا چوڑا؟ ساری بات سوز اور درد کی ہے......''

هك شیریں فرهادے والی گل ونا سنائیوس
عام خلق تهیں سُنی سُنائی چا تصنیف بنائیوس

ترجمہ:

''ان کی جو شیریں فرہاد کی تصنیف ہے۔اس میں اُنہوں نے بات ذرا تبدیل کر کے سُنائی ہے۔شاید اُنہوں نے جیسا کسی سے سُنا تھا اسی طرح کتاب بنا دی ہے۔''

حضرت خسرو' شیخ نظامی دَسدے هور کتابیں
هاشم نے کجھ هور سنائے ناهیں روا حسابیں

ترجمہ:

''حضرت امیر خسرو اور نظامی گنجوی نے اپنی کتابوں میں کچھ اور طرح کہانی بتائی ہے' ہاشم شاہ نے کچھ اس طرح بیان کی ہے کہ اسکا حساب لگانا درست و جائز نہیں ہے۔''

یا اُہ هور هویا کوئی هاشم' هاشم شاہ نہ هویا
یا اُس شیریں خسرو والا مَعلَم راز نہ هویا

ترجمہ:

''یا پھر وہ کوئی اور ہاشم ہے' ہاشم شاہ نہ تھا یا پھر اسے شیریں خسرو کی اصل کہانی معلوم ہی نہ ہو سکی......''

ڈھونڈ روایت سچّی کُوڑی کرنا سی اِہ کارا
خیر اُس درد بیان کرن دا آھا مطلب سارا

ترجمہ:

''سچی یا جھوٹی روایت ڈھونڈ کر اس نے کام سرانجام دے دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ درد اور سوز بیان کیا جائے اور اس نے یہ کر دکھایا......''

مُتقدمیناں دی فرمائے بھنگ نہ پوے پیارے
سُنی سُنائی اس بھی آکھی کِیہ سِر دوس بچارے؟

ترجمہ:

''متقدمین نے جو کچھ کہا اس میں گنجائش نکالنا رنگ میں بھنگ ڈالنے کے مترادف ہے۔ میں بھی اے پیارے! یہی چاہتا ہوں کہ ایسا نہ ہو۔ چنانچہ اس نے بھی سُنی سُنائی کہہ دی ہوگی۔ اس بے چارے کا کیا قصور ہے؟''

بیت ترازو تول بنائیوس سارے لذّت والے
کلیاں چُن چُن ہار پروئیوس نرگس تے گل لالے

ترجمہ:

''اس نے تمام اشعار بحر اور وزن میں کہے ہیں۔ وہ سارے پُر تاثیر و پُر لذت ہیں۔ اس نے نرگس کے پھول اور گل لالہ چُن چُن کر ہار پروئے ہیں......''

کتنا پاک دل اور فرشتہ سیرت شخص ہے جس کے قلم سے ایسی معصوم تنقید نکل رہی ہے جو آج کے تنقید نگاروں کے لئے چراغِ راہ کا کام دے سکتی ہے۔

اس محاکے سے پتہ چلتا ہے کہ میاں صاحب کو شاعری میں لطافت اور ایمائیت بے حد عزیز تھی۔ لیکن وہ اس ایمائیت اور لطافت کے ساتھ ساتھ مولانا روم کی طرح تمثیلی پیرائے کو ملحوظ رکھتے ہیں، تا کہ ابلاغ میں دقت نہ ہو۔ اس تمثیلی پیرایے کو انہوں نے اس انداز سے استعمال کیا ہے کہ ان کی بیان کردہ داستانیں لوک داستان کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔ اور ان کی شاعری عوام کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہوگئی ہے۔

میاں محمد بخشؒ نے ''شیریں فرہاد'' میں بھی چند پنجابی شعراء کا ذکر بڑے احترام سے کیا ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں......

مقبلؒ نوں اج لوڑیئے کون لیاوے لھبّ
وارثؒ شاہؒ کد لبھدا لوڑن چڑھیئے سب

ترجمہ:

''مقبل کو آج ڈھونڈیئے' کون ہے جو ان کو ڈھونڈ کر لائے گا۔ اگر ہم تمام بھی تلاش کرنے لگیں تو وارث شاہ کبھی نہیں ملے گا......''

پیرؔ محمدؒ نہ ملے نہ چرکانہ چھبؔ
ھاشمؔ شاہؒ نوں لوڑیوں لبھدا کت سبب

ترجمہ:

'' جلدی یا دیر میں پیر محمد نہیں مل سکے گا۔ ہاشم شاہ کو اگر تلاش کریں تو وہ بھی کسی سبب نہیں ملے گا......''

حافظ برخوردارؒ بھی اوھلے کیتا ربؔ
احمدؔ یارؒ نہ لبھدا جے سو کرو طلب

ترجمہ:

''اللہ تعالیٰ نے حافظ برخوردار کو بھی چھپا دیا ہے۔ احمد یار بھی نہیں ملے گا خواہ سو دفعہ بھی طلب کرو۔''

قادرؔ یارؒ ھتھ آئوندا ڈھونڈو دن تے شب
کھبل سنبسی چوکھراں مٹھی لگدی ڈھب
للھاں لذت دیندیاں پکے رھن نہ جب

ترجمہ:

''قادر یار کو دن رات تلاش کرو وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ کھبل (ایک اچھی قسم کی گھاس) ختم ہو جائے تو مویشیوں کو 'ڈھب' بھی میٹھی لگتی ہے۔ جب پکے بیر نہ رہیں تو 'للھاں' بھی لذت دینے لگتی ہیں۔''

تنقیدی اصول

شاعر نے اپنی کتاب ''سیف الملوک'' کے شروع میں ہی تنقید کا اصول بیان کر دیا ہے۔ یہ اصول جدید دور کے نقادوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتا ہے۔

دانش مندو' سُنو تمامی عرض فقیر کریندا
آپوں چنگا جے کوئی ہووے ہرنوں بھلا تکیندا

تک تک عیب نہ کردے واندے چنگے لوک کداھیں
نکتہ چینی فتنہ دوزی بھلیاں دا کم ناھیں
عیبوں پاک خداوند آپوں کون کسے نوں آکھے؟
کاھنوں گل کسے دی کرنی میں بھی شاعر بھاکھے
میرے نالوں ھر کوئی بہتر، مہئیں نیچ ایانا
تھوڑا بوھتا شعر سخن دا گھاٹا وادھا جانا
جتھے جتھے گھاٹا واھدا جے میں اُنگل دھردا
احمد یار مُصنف وانگر تاں کوئی مَعلَم کردا
تھوڑی بھتی تھمت کولوں، کون کوئی بچ رھندا؟
پر میں آپوں اوگنھارا دوسریاں نہیں کھندا
پردہ پوشی کم فقر دا، میں طالب فُقراواں
عیب کسے دے پُھول نہ سکّاں، ھر ھك تھیں شرماواں

ترجمہ:

"اے دانش و عقل والو! تم سب اس فقیر کی عرض ذرا غور سے سنو! اگر کوئی خود اچھا ہے تو وہ دوسرے کو بھی اچھا ہی سمجھتا ہے۔ (دوسرے کے لئے بھی بھلا ہی سوچتا ہے)۔

جو اچھے اور بھلے لوگ ہیں وہ کبھی بھی کسی کے عیب دیکھ کر انہیں بری نظر سے نہیں دیکھتے اور نہ انہیں اچھائی سے محروم سمجھتے ہیں کیونکہ نکتہ چینی اور فتنہ اندوزی اچھے اور بھلے لوگوں کا کام نہیں ہے۔

عیب سے خالی تو بس خداوند کریم کی ہی ذات اقدس ہے' باقی سب انسان عیب دار ہیں تو پھر کیوں کوئی کسی کو کہے' کسی کی بات کوئی کیوں کرے اور کس لئے؟ میں بھی تو ایک شاعر گنہگار ہوں۔ کئی شعراء کو پرکھا ہے۔

مجھ سے تو ہر کوئی اچھا ہے' بس میں ہی ایک نیچ اور نادان ہوں۔ میں شعر وسخن کے تھوڑے بہت گھاٹے اور زیادتی کی خبر رکھتا ہوں۔

جہاں جہاں کمی اور زیادتی پائی جاتی ہے اگر میں اُس کی نشاندہی کرتا تو احمد یار شاعر کی طرح معلوم ہوتا۔ یعنی میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ احمد یار نے اپنے سے پہلے کے شعراء پر کڑی تنقید کی ہے جن کے کلام میں فنی خامیاں تھیں۔

دنیا میں کون ایسا شخص ہے کہ جو تھوڑی بہت تہمت سے بچ نکلا ہو۔ ہر کسی پر یہ تھوڑا بہت الزام تو آ ہی جاتا ہے۔ میں تو خود گنہگار ہوں دوسروں کے متعلق کیا بیان کروں؟ دوسرے سب مجھ سے بہتر اور اچھے ہیں۔

کسی کے عیبوں پر پردہ ڈالنا فقراء کا کام ہے اور میں فقراء کا طالب ہوں۔ بھلا میں کسی کے عیب ظاہر کروں گا؟ میں یہ کام ہرگز نہیں کر سکتا بلکہ میں تو خود ہر کسی سے شرمندہ ہوں۔ پھر میں کیسے کسی کے عیب ظاہر کر سکتا ہوں؟''

تصانیف

میاں محمد بخشؒ کی تصانیف میں تیرہ (۱۳) منظوم پنجابی اور ایک منثور فارسی کتاب شامل ہے۔ ذیل میں ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔سوہنی مہینوال

میاں محمد بخشؒ نے اپنی شاعرانہ زندگی کا آغاز سوہنی مہینوال سے کیا ہے۔ یہ 1273ء میں لکھی گئی۔ آپ کی عمر اس وقت 27 سال تھی۔ ان کا انداز بیان دیگر شعراء سے کافی حد تک مختلف ہے انہوں نے عام شعراء کی صنعت گری سے ہٹ کر سادگی بیان کو اپنایا۔

احمد یار خضر تھیں پایا شعر کلام
میںنوں مرشد اپنے کیتا ایہہ انعام
سادی صاف کلام وچہ ہوندادرد تمام
نہیں تاں صنعت پاندی مینوں عقل دوام
عالم صنعت دیکھ کے بہت کرن تعریف
عاماں دے سمجھان نوں کیتی میں تصنیف

ترجمہ:

"(احمد یار نے خضر سے شاعری کا فن حاصل کیا ہے مجھے میرے مرشد نے یہ انعام بخشا ہے۔ سادہ اور صاف کلام میں درد نمایاں ہوتا ہے۔ ورنہ مجھے بھی صنعت کے استعمال میں دوامی قدرت حاصل ہے۔ عالم صنعت دیکھ کر بہت تعریف کرتے ہیں۔ میں نے یہ کتاب عوام کو سمجھانے کے لئے تصنیف کی ہے)"

سادگی بیان کے کئی خوبصورت روپ اس تخلیق میں جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ اس میدان میں وہ اپنے سادہ اور دلنواز اسلوب کی بنا پر دوسرے شعراء پر سبقت لے گئے ہیں۔

عشق مجازی کی اہمت کو واضح کرنے کے علاوہ انہوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ بغیر عشق کے جو زندگی گزرتی ہے وہ زندگی رائیگاں ہے۔

جس نے عشق نہ کھٹیا کیتی عمر زیان
جو دل خالی عشق تھیں اس تھیں بھلے حیوان
دنیا جنگل چھڈ کے عشق شہر وچ آء
دو جا ثانی ایس دا گرم بازار نہ کا

ترجمہ:

''جس نے عشق نہیں کمایا۔اس نے گویا عمر ضائع کی۔جو دل عشق سے خالی ہے اس سے حیوان بھلے ہیں۔دنیا جنگل کو چھوڑ کر عشق کے شہر میں آ۔اس جیسا دوسرا بازار کوئی نہیں ہے۔''

یہ وہی فکر تھی جس نے ''سیف الملوک'' میں جا کر یہ انداز اختیار کیا۔''جس دل اندر عشق نہ رچیا کتے اس تھیں چنگے''۔

نظریہ عشق اور عشق کے خصوصی اوصاف کے بیان کے علاوہ سوہنی مہینوال میں سراپا نگاری اور کردار نگاری کے کئی دلنواز اور دلنشین نقش پائے جاتے ہیں۔سوہنی کے باپ تلا کی دستکاری اور ہنرمندی کا مختصر ترین الفاظ میں اظہار شاعر کی اپنی مہارت کا خوبصورت نمونہ ہے۔

منی اوس دے ہتھ تھیں ہوندی چاندی خام
دیوے خاک محمدا لئے ہزاراں دوام

ترجمہ:

''وہ اپنے ہاتھ کی مہارت سے مٹی کو چاندی بنا دیتا۔وہ خاک دیکر ہزاروں روپے وصول کرتا تھا۔''

مہینوال سے اس کی شکایت کا انداز بھی لاجواب ہے۔

آکھے مہینوال توں پالیئوں پتراں ہار
پھلاں وانگر رکھیوں، بن ڈھکوں ھن خار

ترجمہ:

''اس نے مہینوال سے کہا میں نے تو تمہیں بیٹوں کی طرح پالا پوسا ہے۔میں نے تمہیں پھولوں کی طرح رکھا۔لیکن تو خار (کانٹا) بن کر چبھنے لگا ہے۔''

مہینوال سے شکایت کا اس سے موثر اظہار ممکن نہیں تھا۔

عزت بیگ کے حسن و جمال کے اظہار میں بھی میاں صاحب کے قلم نے فنکارانہ چابکدستی کا اسلوب اختیار کیا ہے۔

تھوڑی وانگ خبانیاں جوھونوں رسدار
سیو بھی دیکھ کے شرم کرن ھنجار
پھل رویل کنوتیاں موتیں جڑے قطار
نیویں دسن قد تھیں سرو سفید چنار
وانگ بلوریں بوتلے گردن صاف کھڑے
دیکھ زور آور بازو واں چترا شیر ڈرے

ترجمہ:

"اس کی ٹھوڑی رسدار خوبانی جیسے تھی، اور سیب بھی اسے دیکھ کر شرم محسوس کرتے تھے۔
اس کے قد سے سرو اور چنار بھی چھوٹے تھے، اور بلوریں بوتل کی مانند اس کی صاف گردن تھی اور اس کے زور آور بازوؤں سے "چترا شیر" بھی ڈرتا تھا۔"

مردانہ وجاہت اور بہادری و جرأت کی اقدار میاں صاحب کو بہت زیادہ پسند ہیں۔ان کے دیگر ہیروز کی مانند عزت بیگ میں بھی یہ جوہر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔سوہنی کی خوب صورتی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس کی خوش گوئی کے وصف کو خصوصاً نمایاں کیا ہے۔

جھڑ دے پھل دھان تھیں جاں اوہ ھسے کُھل
ٹھوڈی ویکھ محمدا سیب خبانی بُھل
گاٹا مرلی دانگ سی دلکش کر دی قول
بلبل طوطی قمریاں ھٹن اس دے سن بول
سن آواز آسمان تھین زھرہ آوے کول
سادہ رو محمدا زیور سٹے کھول

ترجمہ:

"جب وہ کھل کر ہنستی تھی، اس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے، اس کی ٹھوڈی دیکھ کر اے محمدؒ سیب اور خوبانی بھول جاتے تھے۔
اس کی گردن مرلی جیسی تھی، اور وہ دلکش گفتگو کرتی تھی۔اس کو باتیں سن کر بلبل طوطی اور قمریاں گر پڑتی تھیں۔اس کی آواز سن کر آسمان سے زہرہ اس کے پاس آجاتی تھی۔اے محمد بخشؒ وہ سادہ روتھی اور اس نے زیور اتار پھینکے تھے)"

سوہنی کے ظاہری حسن کے بیان کے لئے بڑی موثر اور اچھوتی تشبیہات کو استعمال کیا گیا ہے۔

نـرم قـدم تك كیـلیـاں پھلیـاں چھل اوتـار
سـوهـنـی حسـن مـحـمـداٰ كهـڑیـا بـاغ بهـار
سـنبـل وال زنـجیـریـاں چهـره پهـل گـلاب
اكهیـں نـرگـس مسـت سـن بهـریاں نال خمار
دهـنـی عـطـر عبیـر تهیں بهـری رهـے هـر دم
كـاغـذ جیـوں كشمیـر دا تیـنـوں اُتـلا چـم

ترجمہ:

''وہ چھلکا اترے کیلوں کی طرح نرم اندام تھی۔ اے محمد! سوہنی کا حسن کھلا ہوا باغ تھا۔ اس کے بال سنبل کی طرح گھنگریالے اور چہرہ گلاب جیسا تھا۔ آنکھیں نرگس کی طرح خمار سے بھری رہتی تھیں۔ اس کی ناف ہر دم عطر اور خوشبو سے بھری ہوئی تھی۔ اور اس کا اوپر کا گوشت پوست کشمیر کے نازک کاغذ جیسا تھا۔''

اس تصنیف کا ضروری وصف وحدت الوجود سے میاں صاحب کا گہرا شغف اور تعلق ظاہر کرتا ہے۔ عشق مجازی کو عشق حقیقی کی ایک کڑی تصور کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے مظہر کائنات کو جمال حقیقی کا پرتو سمجھا ہے۔

هـكـو ذاتـی نـور سـی دوهـی نـه آهی مول
میـں تـوں والـی گـفتـگـو نـاهـی تدن قبول
اوه جـمـال كـمـال سی پـردے میـں مستـور
آپے سـی نـاظـر حسـن دا آپے سـی منظور

ترجمہ:

''ایک ہی ذاتی نور تھا دوسری کوئی چیز ہی نہ تھی۔ اس وقت میں اور تو کی گفتگو نہ تھی۔ وہ جمال کمال پردے میں مستور تھا۔ وہ خود ہی ناظر اور خود ہی منظور تھا۔''

فکری اور فنی لحاظ سے میاں صاحب نے اس کتاب کے بارے میں یہ صحیح تحریر کیا ہے۔

حـال حـقیـقـت دوهـانـدی ظـاهر هوسی تد
انـدر اس كتـاب دے لـكـھ سـنـاسـاں جـد
خـرچ كـریسـاں اس وچـه ایسـے دم هكوار
سُـچـے مـوتـی حـكمتوں سل پر وسـاں هـار

انگل ٹکسن گور وچ سُن سُن ایہہ اشعار
احمد یار محمد نالے قادر یار

ترجمہ:

''دونوں کی حال حقیقت اس وقت ظاہر ہوگی جس وقت میں اسے اس کتاب کے اندر لکھ کر سناؤں گا۔ میں اس میں بے حد قیمتی موتی خرچ کروں گا۔ اور حکمت کے سچے موتیوں کا ہار پرودوں گا۔

اے محمد! یہ اشعار سن کر قبر میں احمد یار اور قادر یار اپنی انگلیاں کاٹیں گے۔''

میاں صاحب نے یہ بتایا ہے کہ یہ داستان مغل فرمانروا شاہجہاں کے عہد میں رونما ہوئی۔

۲۔ تحفہ میراں

یہ کتاب اصل میں میاں محمد بخشؒ کا غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانیؒ سے اظہار عقیدت اور گہری محبت ہے۔ جس میں آپ نے ان سے اپنی عقیدت ارادت کے ساتھ ساتھ غوث اعظم کے مناقب وفضائل بیان کئے ہیں۔ انہوں نے یہ مناقب فضائل جن مستند معتبر کتابوں سے لئے ہیں ان کے نام بھی درج کئے ہیں۔ میاں صاحب نے یہ کتاب ۱۲۷۴ھ میں لکھی۔

قلم میری نے جیکر کوئی لکھیا حرف اولا
نال کرم دے کجیں حضرت بخشش داپا پلا

ترجمہ:

''میرے قلم نے اگر کوئی نامناسب لفظ لکھا ہے، تو اے حضرت اپنے کرم کے ساتھ اس پر بخشش کا پردہ ڈال دیجئے۔''

میاں صاحب کے علمی تبحر کا اندازہ ان حوالوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۔ جبکہ میری منّوں ناہیں دیکھو کھول ھدایہ
(اگر میری بات نہیں مانتے تو ''ھدایہ'' کھول کر دیکھئے)۔

۲۔ وچہ مخزن اسرار نظامی دتی خبر تسانوں
(''مخزن الاسرار'' میں نظامیؒ نے آپ کو خبر دی ہے)۔

۳۔ وچہ اسرار السالکین ویکھو ایہہ گواھی
(''اسرار السالکین'' میں یہ گواہی دیکھو)۔

۴۔ وچہ مقامات الغیاثی لکھی ایہ کہانی
("مقامات الغیاثی" میں یہ کہانی لکھی ہوئی ہے)۔

۵۔ مجموعة الفضائل اندر لکھی بات پیاری
("مجموعۃ الفضائل" میں یہ پیاری بات لکھی ہوئی ہے)۔

۶۔ وچہ ملفوظ محمد بیٹے ابراهیم البدری
ایہہ منقول صحیح رفیقوں لکھیا آیا نظری
(ملفوظ میں محمد ابن البدری کو صحیح بخاری میں یہ روایت منقول دکھائی ہے)۔

۷۔ شواهد النبوة اندر حضرت عارف نامی
عبدالرحمن مولیٰ میرا لقب جنہاندا جامیؔ
("شواہد النبوۃ" میں عبدالرحمٰن جامی نے لکھا ہے)۔

۸۔ جواهر القلائد اندر لکھی ایہہ گل جانو
(جان لو، یہ بات "جواہر القلائد" میں لکھی ہوئی ہے)۔

۹۔ بهجته الاسرارے اندر ہور روایت کردا
("بہجۃ الاسرار" میں بھی اور روایت بیان کی گئی ہے)

۱۰۔ تلخیص القلائد اندر ایہہ مذکور لیاندا
("تلخیص القلائد" میں اس کا ذکر کیا گیا ہے)۔

۱۱۔ عارف المعارف اندر شیخ شہاب الدینے
باب اکیویں وچہ فرمایا منوں نال یقینے
(شیخ شہاب الدینؒ نے "عارف المعارف" میں اکیسویں باب میں لکھا ہے اسے یقین سے مانو)

۱۲۔ ایہہ مناقب میراں جی دا شیخ دائود لکھایا
دیکھ خصوص الحکم کتابے دیباچے وچ آیا
(شیخ داؤد نے میراں جی کا یہ "مناقب" لکھوایا ہے۔ "خصوص الحکم" کے دیباچے میں اس کا ذکر کیا گیا ہے)

۱۳۔ شرح اندر مشکوٰة صحیح دے شیخ علی فرمایا
(مشکوٰۃ صحیح کی شرح میں شیخ علی نے فرمایا ہے۔)

۱۴۔ شیخ احمد اك مغرب اندر مرد بھلیرا صادق
لکھے رسالہ عربی اندر میراں دے وچ خوارق

(شیخ احمد مغرب میں اک صادق اور بھلے انسان نے عربی میں میراں جی کے خوارق پر اک رسالہ لکھا ہے)۔اس کے ساتھ اصل عربی عبارت کا اقتباس بھی درج ہے۔

۱۵۔ لکھیا ھے مخدوم جھانی وچه مسافر خانه
(مخدوم جہانی نے ''مسافر خانہ'' میں لکھا ہے)۔

۱۶۔ وچ کتاب مخازن لکھیا اندر ذکر اماماں
(ائمہ کے ذکر میں ''کتاب مخازن'' میں لکھا ہے)۔

۱۷۔ وچ ملفوظ غیاثی لکھیا ایھه قبت شھانه
(ملفوظ غیاثی میں یہ شہانہ قبت درج ہے)۔

۱۸۔ پر محمد سید حسینی جو لمے گیسو والا
وچ کتاب لطائف لکھدا ایھه بیان اجالا
(محمد حسینی گیسودراز نے کتاب ''لطائف'' میں یہ روشن بیان لکھا ہے)

۱۹۔ اندر سیر العارفین کھیا شیخ جمالی
(''سیر العارفین'' میں شیخ جمالی نے کہا ہے)

۲۰۔ حضرت سید آدم لکھیا وچ نکات اسرارے
(''نکات اسرار'' میں حضرت سید آدم نے لکھا ہے)

ان ماخذات سے پتہ چلتا ہے کہ ''تحفہ میراں'' عقیدت اور علمیت دونوں کا نادر اور لاجواب مرقع ہے۔اس سے آپ کے علمی کمال پہ حیرت ہونے لگتی ہے۔

۳۔ قصہ شیخ صنعانؒ

اس کتاب کا موضوع بھی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ذات بابرکات ہے۔اس میں انہوں نے شیخ صنعان کی غوث اعظم سے روگردانی کے بعد انہیں پیش آنے والے حالات بیان کئے ہیں۔یہ قصہ حضرت عطارؒ کی ''منطق الطیر'' سے ماخوذ ہے۔''منطق الطیر'' کے علاوہ میاں صاحب مولانا عبدالرحمٰن جامی کی مشہور کتاب ''نفحات الانس'' سے بھی متاثر نظر آتے ہیں۔اس کا سن تصنیف ۱۲۷۴ھ ہے۔ایک اعتبار سے یہ ''تحفہ میراں'' سے مربوط ہے۔یہ کتاب ہر قسم کے لفظی صنعت گری سے پر ہے اور صنائع بدائع میں اپنی مثال آپ ہے۔اگرچہ مشکل ہے مگر دلچسپ ہے اور حضرت میاں صاحب کی علمی فضیلت کی مظہر ہے۔

''قصہ شیخ صنعان'' ایک غیر مسلم عورت کی سراپا نگاری لاجواب انداز میں بیان کی گئی ہے۔ جس کے دام میں شیخ صنعان گرفتار ہو گئے تھے۔

مھــرا ویــکـــھ دھــن دا زھــرہ زھــر ھـو جـــاوے
مـلك فـلك دی تك نـــہ سـكـدی کھـوہ غبغب مت پاوے
لـــب لالـــی تك لـولـو لالا لـعـل نــو شــرم کــے
لاہ ٹــوپــی لاہ لاہ ســٹــے لـــہ لـــہ چھـرہ تك كــے
جـوڑہ ابـرو وانگ کـمـانــاں طـاق آھے وچـہ خوبی
دانــے ویـکـھ ھـوون دیـوانـے اوسپـر تـم محبـوبی
مـرگ نیـنـانـدے مارکٹاراں مرگ کھتن جیوں جنگی
سـو سـو خـون کـرن وچـہ پلکاں پلکاں تیر خدنگی
چـانـدی پیـر تلی تك چاندی چاھندی چھکی جاندی
پـکـڑے پیـراوھـدے کـرتـکـڑے چھانجر ھو سوھاندی
قـد سـفیـدے وانـگـر سـدھـا رنگ سـفیـد چـنبیلی
کن زلفاں وچہ دسدے جیوہ وچہ سبزی پھول رویلی
پـریـاں ویـکـھ ھـوون دلبـریاں کرن طواف چوفیرے
دیــوے وانــگــن دیـوے لاٹــاں روشـن کـرے ھـنیـرے

ترجمہ:

''اس کے دہن کو دیکھ کر زہرہ بھی زہر بن جائے۔ آسمان کے فرشتے بھی اس طرف نہ دیکھتے کہ کہیں غبغب کے کنویں میں نہ ڈالے جائیں۔
اس کے سرخ لب دیکھ کر سرخ موتی بھی شرمندہ ہو جاتے اور اس کا دمکتا سرخ چہرہ دیکھ کر گل لالہ بھی ٹوپی اتار پھینکتا ہے۔
ابرو کمانوں جیسے تھے، اور خوبی میں طاق۔ انہیں دیکھ کر دانا دیوانے ہو جاتے تھے۔
اس کے نینوں کے مرگ، کٹار مار کر ہلاک کر دیتے تھے۔ اس کی پلکوں کے خدنگی تیر ایک وار میں سوسو خون کرتے تھے۔
اس کے پاؤں چاندی کی طرح سفید تھے، چاندی بھی اس کے طرف کھچی چلی جاتی تھی۔ اس کے پاؤں اور مضبوطی سے چھانجر (پازیب) پکڑ لیتی اور زیادہ خوب صورت دکھائی دیتی ہے۔
اس کا قد سفیدے کی طرح سیدھا تھا۔ اور رنگ سفید چنبیلی جیسا تھا۔ کان زلفوں میں یوں نظر

آتے۔ جیسے سبزے میں روئیل کا پھول ہو۔
پریاں بھی اسے دیکھ کر اس پر فدا ہو جاتی تھیں اور اس کے ارد گرد طواف کرتی تھیں، اور دیئے کی طرح روشنی دیتی تھی۔ اور اندھیرے دور کرتی تھی۔''
شیخ صنعان کی بے قراری اور بے چینی دل کو میاں صاحب نے بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

آکھے اج نہیں دن چڑھنا رات نہ جاندی غم دی
یا سورج نوں نور نہ رہیا صبح نہیں اج تھمدی
وچہ ریاضت عمر گذاری راتیں جاگ لھنگایاں
اگے ایسی رات نہ دیکھی مشکل یارب سایاں
اکھیں نیند نہ آب دلیوچہ باھجوں لھو جگر دی
وانگ شمع دے روندا مڑدا اوہ پرواہ نہ دھردی

ترجمہ:

''وہ کہتا تھا آج دن نہیں نکلے گا۔ غم کی رات ختم نہیں ہو رہی، یا تو سورج میں نور نہیں رہا۔ آخر آج صبح کیوں نہیں ہو رہی۔ (سورج طلوع کیوں نہیں ہو رہا)۔
میں نے ریاضت میں عمر گزاری اور راتیں جاگ کر گزاریں۔ لیکن اے خدا! میں نے ایسی مشکل رات پہلے کبھی بھی نہیں دیکھی۔
نہ آنکھوں میں نیند ہے نہ دل میں طاقت ہے۔ جگر کے لہو کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ شمع کی طرح میں جل رہا اور رو رہا ہوں۔ لیکن اسے میری ذرہ بھی پرواہ نہیں ہے)۔''
اس قصہ میں تجربات زندگی کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

باز اگے پردار کبوتر کرسی کی دلیری
کی خرگوش بچاراکرسی نال ۆبردے شیری
لسا ھوکے نال زور آور جو کوئی کردا پنجہ
ھو بے زورگرے کھا دکھا لوں لوں ھووھے رنجہ
زال عصا پھڑ ٹرنے والا بیٹھا اٹھ نہ سکے
رستم نال کرے چاکشتی جان دیوے ھك دھکے

ترجمہ:

''باز کے آگے پردار کبوتر کیسے مقابلہ کر سکتا ہے، خرگوش بیچارا ببر شیر کے ساتھ کیا مقابلہ کرے گا۔

کمزور ہو کر جوزور آور کے ساتھ پنجہ آزمائی کرتا ہے۔ وہ بے زور ہو کر دھکا کھا کر رنجیدہ ہو کے
گر پڑھتا ہے وہ بوڑھا جو عصا پکڑے بغیر اٹھ نہ سکے۔ جب رستم کے ساتھ جب کشتی کرے گا
تو وہ ایک ہی دھکے میں مر جائے گا۔''

اس قصہ میں فنی لحاظ سے کردار نگاری اور سراپا نگاری بلندی نظر آتیں ہیں۔ قادر الکلامی کے بارے میں تو خود میاں صاحب کا دعویٰ یہ ہے۔

احمد یار خضر تھیں پائی سبزی باغ سخن دی
مینوں پیر میرے ھن بخشی عجب بہار چمن دی
کلك میری اك ھرن ختن دا ملن نه دے وچھیرے
ھر جنگل کستوری حُلّے چھنڈ دی جائے چوفیرے
تیز زبان قلم تھیں اگے جاوے کتنی منزل
ترکھی طبع زبانوں میری کیتی مرشد کامل
طالب ھون لکھن والے ھوش ھووے وچ تھانویں
راتیں دیھاں لکھدے چلن گھڑی نه جالن بھانویں

ترجمہ:

''احمد یار نے خضر سے شاعری کے باغ کی شادابی پائی ہے۔ مجھے میرے پیر نے چمن کی بہار بخشی ہے۔
میرا قلم اک کستوری والا ہرن ہے جو کسی گھوڑے کو قریب پھٹکنے نہیں دیتا۔ یہ قلم ہر جنگل میں خوشبو چاروں طرف پھیلاتا جاتا ہے۔
میری تیز زبان قلم سے بھی کئی منزل آگے ہے۔ میری طبع اور زبان کو یہ سرعت مرشد کامل نے عطا کی ہے۔
اگر لکھنے والے طلب رکھتے ہوں اور ان کے حواس بجا ہوں تو وہ دن رات لکھتے جائیں اور ایک گھڑی بھی نہ رکیں۔ تو میری سخن دری میں فرق نہیں آئے گا۔

۴۔ نیرنگ عشق

۱۲۷۵ھ میں میاں صاحب نے غنیمت کنجاہی کی مشہور مثنوی ''نیرنگ عشق'' کا پنجابی میں ترجمہ کیا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو فارسی ادب سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ غنیمت مختصر ترین الفاظ میں جس

سحر بیانی سے اظہار مدعا کرتا ہے۔اسے ترجمہ میں منتقل کرنا کرنا بڑا مشکل کام ہے۔لیکن اس مشکل کام کو میاں صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا ہے۔"

اگر چہ آپ نے اسے فارسی سے پنجابی میں ڈھالا ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مثنوی پنجابی میں آپ کی اپنی تخلیق ہے۔آپ نے ترجمے میں بعض جگہ پر معمولی رود بدل بھی کیا ہے۔مثلاً غنیمت کنجاہی نے شاہ محمد صالح کی منقبت لکھی ہے اور شاہ اورنگ زیب کی مدح بھی۔لیکن میاں صاحب نے ان دو مذکور شخصیات کی بجائے اپنے پیر روشن ضمیر سائیں غلام محمد صاحبؒ اور دوست باقر علی شاہ صاحب کی شخصیت کے بارے تحریر کیا ہے۔ترجمہ کے لئے "نیرنگ عشق" کا انتخاب اس کی فنی خوبیوں کے علاوہ اس کی فکر سے بھی متاثر ہو کر کیا گیا ہے۔غنیمت کنجاہی عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ تصور کرتا ہے۔اور اسی بات کا اظہار میاں صاحب نے دیگر تصانیف کے علاوہ اپنی تصنیف "سوہنی مہینوال" میں بھی کیا ہے۔

غنیمت کنجاھی کا نکتہ نظریہ ھے۔

نماندش بعد ازاں پروائ شاھد
کہ شد سرتا قدم ماوئ شاھد
خلیل کعبۂ ملك یقیں گشت
مقر لَا اُحِبُّ الآفلین گشت
جمال لایزالش چھرہ بنمود
شکست آں بُت کہ نامش غیر او بود

میاں صاحب نے ان اشعار کو اس انداز سے پیش کیا ہے۔

نہ پھر اس کو رھی پروائے شاھد
ھوا سرتا قدم خود جائے شاھد
خلیل آخر ھوا ملك یقیں کا
مقر لا اُحِبُّ الآفلین کا
ڈٹھا روشن جمال اللہ واحد
ٹٹا اوہ بت جو ھے سی غیر شاھد

۵۔ شیریں فرہاد

یہ کتاب شیریں فرہاد کی رومانی داستان پر مبنی ہے۔میاں صاحب نے اپنی اس تصنیف میں فارسی کے

مشہور شعراء نظامی گنجویؒ اور امیر خسروؒ کی مثنویوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے لیکن کہیں کہیں بعض مقامات وہ آپ ان سے صرف نظر کر گئے ہیں۔ آپ نے یہ کتاب ۱۲۷۶ھ کو تصنیف کی۔ اس کتاب کو سیف الملوک جیسی شہرت نصیب نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس میں وہ تمام فکری اور فنی خوبیاں موجود ہیں جو سیف الملوک کی شہرت کا سبب بنیں۔

فرہاد کی عظمت کو سراہتے ہوئے انہوں نے عظمت آدم کو بھی اجاگر کیا ہے۔

پاك خداوند سرجیا آدم ڈاھڈی شئے
ھمت دا لك بنھ لے جھدر لگ پے
پٹ پھاڑاں سٹدا دریا سھد لئے
کرے حساب آسمان دا غیبی خبر لے
کردا چھیك زمین نوں جاں پڑمل بھے
سخت مصیبت عشق دی اوہ بھی سر سھے
کیھڑا کم جھان دا اس تھیں جو رھے
پر اك موت محمدآ اس پر ڈاھڈی ھے

ترجمہ:

''خداوند تعالٰی نے آدم ایک زبردست چیز پیدا کی ہے۔ کہ یہ کمر بستہ ہو کر ہمت کے ساتھ جو بھی کام کرے، کر سکتا ہے۔ یہ پہاڑوں کو اکھاڑ کر پھینک سکتا ہے۔ دریا کو روک سکتا ہے۔ آسمان کا حساب لگا سکتا ہے۔ غیبی خبریں معلوم کر لیتا ہے۔ جب میدان میں آجائے تو زمین میں شگاف ڈال سکتا ہے۔ عشق کی سخت مصیبت بھی سہہ لیتا ہے۔ دنیا کا کون ایسا کام ہے جو یہ نہیں کر سکتا لیکن اک موت اس پر بھاری ہے۔''

موت اور فنا کا احساس انسان کے دل میں ہمیشہ قائم رہا ہے۔ اس حقیقت کو میاں صاحب نے ''شیریں فرہاد'' میں اپنی ذات کے حوالے سے بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔

سبھو مڑ گھر آوسن پا میرے سر خاك
بھیناں تے بھرجائیاں لیسن کڑے بولاك
خیر سبھو سو کھہ وسسن کون ھوسی غمناك
ماپیو ھون یا علی بخش رو رو ھون ھلاك
یار ھون جے سچیلے رون سر پٹاك

آپوں اپنے غم تھیں کراں گریبان چاك
یاراں چین محمدؔا مینوں غم خوراك
پرجے راضی رب ہے کوئی نا ھیں باك
کوڑا سچا روسن ھك دن ھك رین
فیر گھرو گھر جائیکے سارے کرسن چین
سچا رون والڑا یار نہ بھائی بھین
تاھیں آپ محمدؔا رواں کر کر وین

ترجمہ:

''میرے سر پر خاک ڈال کر سب اپنے گھر لوٹ آئیں گے۔ بہنیں اور بھابیاں کڑے اور بولاک (زیور) لے لیں گی۔

پھر آرام سے رہیں گے۔ کون غم ناک ہوگا۔ اگر ماں باپ یا علی بخش ہوتے، تو رو رو کر ہلاک ہو جاتے۔ اگر سچے یار ہوں، تو سر پٹک کر روئیں۔ میں اپنے غم کے ہاتھوں خود ہی اپنا گریبان چاک کرتا ہوں دوستوں کو چین نصیب ہے۔ اور میری خوراک غم ہے۔ مگر اگر خدا راضی ہے تو کوئی ڈر نہیں۔ جھوٹ موٹ یا سچ پر مبنی ایک دن یا ایک رات روئیں گے۔ پھر سارے اپنے اپنے گھر جا کر آرام کریں گے۔

میرے لئے سچا رونے والا کوئی دوست یا بھائی بہن نہیں۔ اسی لئے اے محمد میں رو رو کر خود بین کرتا ہوں۔)''

اسی احساس فنا اور احساس تنہائی نے انہیں اس ذات سے وابستگی پر ابھارا، جو انسان کو ابدی زندگی سے ہم کنار کرتی ہے۔ خوشی اور غم کے پہلو بہ پہلو دکھائی دینے والے مختلف مناظر کو انہوں نے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے۔

ھکناں دے گھرویاہ نے وجن ڈھول تمھال
ھکناں ماتم سجرا پٹدے پٹدے وال
ھکناں دے گھر شادیاں گاون سوھلے گال
ھکناں دے گھر ماندگی سب پئے بے حال
ھکناں گھر سرداریاں گھوڑے مھیں مال
ھك کرندے لائیاں پھردے بنے کنگال
ھك کھیڈن چڑ گھوڑیاں ھتھیں بازبھال

گھر گھر پھردے منگدے ھکناں تھہ رومال

ترجمہ:

''ایک کے گھر میں شادی ہے اور ڈھول بج رہے ہیں۔ دوسروں کے گھر میں نیا ماتم بپا ہے اور وہ رو پیٹ رہے ہیں۔ ایک کے گھر میں شادی ہے اور خوشی کے گانے گائے جا رہے ہیں۔ دوسروں کے گھر میں بیماری ہے اور سب بے حال ہیں۔ ایک سرداریاں کر رہے ہیں ان کے گھروں میں گھوڑے بھینسیں اور کئی مال مویشی ہیں۔ ایک دوسروں کی فصل مزدوری پر کاٹتے ہیں اور کنگال ہو کے پھرتے ہیں۔

ایک گھوڑوں پر سوار ہو کر ہاتھوں پر باز بٹھا کے شکار کرتے پھرتے ہیں۔ ایک گھر گھر مانگتے پھرتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں خیرات حاصل کرنے کو رومال ہے۔''

میاں صاحب کی دیگر تصانیف کی طرح ''شیریں فرہاد'' میں بھی تصوف کا رنگ نمایاں اور گہرا ہے۔ زندگی کے فلسفیانہ رموز اور معرفت کے دور رس نکات کے علاوہ سراپا نگاری کو بھی اجاگر کیا ہے۔ یہاں وہ نظامی اور خسرو کے ہم پلہ دکھائی دیتے ہیں۔ سوہنی کی طرح شیریں کے حسن و جمال کی توصیف میں انہوں نے خوش روئی اور خوش گوئی دونوں صفات کو واضح کیا ہے۔

کوئل وانگن بولدی بہت پیاری گل
(کوئل کی طرح وہ بہت پیاری گفتگو کرتی تھی)

شکر مصری ونڈ دی کردی جدوں کلام
مٹھی اوہت محمدا شیریں اوسدا نام
(جب وہ گفتگو کرتی یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ مصری بانٹ رہی ہو۔ اے محمد! اس کی باتیں میٹھی تھیں۔ اسی لئے اس کا نام شیریں تھا)

جس دل اندر عشقدی اگ ذرّہ اک ھو
جانے اوہ محمدا سڑدا جگ سبھو
(جب دل کے اندر عشق کی آگ کی ایک چنگاری بھی ہو، وہ تمام دنیا کو جلتے ہوئے دیکھتا ہے)

۲۔ سیف الملوک

اس لافانی کتاب کا سال تصنیف ۱۲۷۹ھ ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو آگے آ رہی ہے۔

۷۔تحفہ رسولیہ

یہ کتاب ۱۲۸۱ھ میں لکھی گئی۔اس میں سیرت النبی کو بڑے دلنشین انداز میں نظم کیا گیا ہے۔زیادہ توجہ حضورؐ کے معجزات کے بیان پر دی گئی ۔ پنجابی ادب میں نعت کی روایت بڑی مستحکم اور قدیم ہے۔میاں صاحب نے اس میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔اصل میں یہ کتاب ملا معین کاشفی کی مشہور کتاب ''معارج النبوۃ'' کا پنجابی منظوم ترجمہ ہے۔تحفہ رسولیہ میں جہاں سرکار دوعالمﷺ کے بہت سے اہم معجزات بیان فرمائے ہیں وہاں سیرۃ پاک کے کئی دوسرے پہلو بھی سامنے لائے ہیں۔یہ ایک نہایت ہی عمدہ کتاب ہے جس میں میاں صاحب کے علم کا استدلالی رنگ خوب نمایاں ہے۔

تحفہ رسولیہ میں ہدایت سے متعلق ان آیات قرآنی کی تفسیر پیش کی گئی ہے۔

''ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی بناوٹ دی پھر اس پر راہ کھول دی۔''

''وہ خالق جس نے تجھے جسم وجود عطا فرمایا۔ضروری ہے کہ اس نے تمہاری ہدایت کا سامان بھی کیا ہو۔''

میاں صاحب نے انہیں قرآنی معارف پر اپنے استدلال کی بنیاد قائم کی ہے۔ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ جس نے ہماری رہبری اور راہنمائی کا سامان بھی مہیا کیا ہے، یہ رہبری ہمیں نبوت کی صورت میں عطا کی گئی ہے۔اس حقیقت کو''تحفہ رسولیہ''میں بڑے سادہ اور عام فہم انداز میں اس طرح کیا گیا ہے۔

صورت سیرت آپو اپنی کردتی کرتارے
ھک کیڑے وچہ پیراں رلدے ھک پر بخش اڈارے

(''ہر ایک چیز کو اللہ تعالیٰ نے جدا جدا صورت اور سیرت بخشی ہے۔ایک کیڑے مکوڑے وہ ہیں جو پیروں تلے روندے جارہے ہیں اور ایک وہ جو پروں کی مدد سے اڑتے پھرتے ہیں)۔

اس بحث میں عظمت آدم کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔عظمت انسانی کو دلائل سے ثابت کرنے کے بعد اس بات پر اظہار افسوس بھی کیا گیا۔ہے کہ اکثر انسان نور نبوت سے فیض یاب ہو کر اپنی صلاحیتوں کو جلا نہیں بخش رہے۔

ھوندے پر نہ اڈرے اوچی سورج لو نہ چاھے

''پر ہوتے ہوئے وہ اونچی پرواز نہیں کرتا۔اور سورج کی روشنی نہیں چاہتا''۔

نبوت کی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد انبیاء کے معجزات اور سحر کے فرق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

معجزات کی مختلف اقسام بیان کی گئی ہیں۔ معجزات عقلیہ اور معجزات حسی کے تحت نبی کریم ﷺ کے معجزات بالوضاحت پیش کیے گئے ہیں۔ میاں صاحب کا امتیازی وصف ان کا انتہائی عقیدت میں ڈوبا ہوا شیریں لہجہ ہے۔ اس لہجے کی حلاوت اور گھلاوٹ، احترام و عقیدت کی اس روایت کی عطا ہے۔ جس نے میاں صاحب کو یہ کہنے پر مجبور کیا۔

جے لکھ واری عطر گلابوں دھوئیے نت زباناں
نام انہاں دے لائق ناھیں کی کلمے دا کاناں

ترجمہ:

''لاکھ بار اگر زبان کو عطر و گلاب سے دھویا جائے تو پھر بھی اس قابل نہیں ہے کہ حضور ﷺ کا نام لے سکے۔ قلم تو خیر بہت ہی ہیچ اور حقیر چیز ہے۔''

مقام مصطفیٰ کی عظمت کا احساس انہیں اپنی پستی کا احساس دلاتا ہے، ان کی طبیعت ہزار ہا گلہائے عقیدت پیش کرنے کے باوجود سیر نہیں ہوتی۔ یہ بے پناہ احترام و عقیدت اور عجز و انکسار میاں صاحب کو بلند پایہ نعت گو شعراء کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

۸۔ قصہ شاہ منصورؒ

اس میں میاں صاحب نے منصور حلاج کی شخصیت اور حالات وواقعات بیان کئے ہیں۔ جو انہیں نعرہ مستانہ ''انا الحق'' لگانے کے بعد پیش آئے۔ شاہ منصور کا یہ قصہ پنجابی شاعری کی مشہور صنف سی حرفی میں لکھا گیا ہے۔ میاں صاحب نے یہ قصہ ۱۲۷۵ھ ہجری میں تحریر کیا۔

منصور حلاج ایک متنازعہ شخصیت ہیں۔ لیکن پھر بھی صوفیائے کرام کے نزدیک اس کو اہم مقام حاصل رہا ہے۔ مولانا رومؒ، شیخ فریدالدین عطارؒ، شاہ شمس تبریزؒ اور علامہ اقبالؒ جیسے بلند درجہ متصوفین نے منصور کو بوجوہ پسند فرمایا ہے۔ شاہ منصور، حضرت میاں محمد بخشؒ کا بھی پسندیدہ کردار ہے۔ انہوں نے قصہ کی غرض وغایت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اور منصور کی حقیقت کو واضح کیا ہے۔

اس کتاب میں ان واقعات کا بھی ذکر ہے جن کی بنا پر حضرت حسین ابن منصور حلاج کو مصلوب کیا گیا اور یہ بھی بتایا کہ ان کو صرف ''انا الحق'' کہنے کی پاداش میں ہی مصلوب نہیں کیا گیا تھا بلکہ کچھ دیگر محرکات بھی تھے جن میں وزیر حامد العباس کی دشمنی اور حضرت حسین ابن منصور حلاج کا حج کے بارے میں وہ مضمون ہے جو انہوں نے حضرت حسن بصری سے نقل کیا تھا۔ جب کہ قصے کی چند ایک تاریخی کمزوریوں کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ تاہم فنی لحاظ سے قصہ شاہ منصور میاں محمد بخشؒ کی شاہکار تخلیقات میں سے ایک ہے۔

حق منصور حسین والی اگے عشق دی بات سناوساں میں
متے عاشقاں دی گل آکھنے تھیں ذرہ عشق حقانیوں پاوساں میں

کیتا ایہ سوال پیاریاں نے خاطر دوستاں دی جھٹ لاوساں میں
جتھے ہوگ محمدا چنگ ربی کھلاں پھوک دی خوب مچاوساں میں

ترجمہ:

''میں منصور حسین کی سچی عشقیہ داستان سناؤں گا۔شاید عاشقوں کی بات بیان کرنے سے مجھے بھی عشق حقانی کا ذرہ بھر لطف حاصل ہو جائے۔ پیارے دوستوں کی فرمائش پر کچھ وقت ادھر لگاؤں گا۔اور جہاں عشق خداوندی کی چنگاری کا بیان ہوگا اسے خوب کھول کر بیان کروں گا۔''

اس کے آخر میں انہوں نے اپنی چند تصانیف کا ذکر بھی کیا ہے۔فرماتے ہیں۔

اول آکھ قصہ مہینوال والا، دھواں عاشقاں دا سلگایا ای
تحفہ میراں نے وچ جناب عالی، فیر صدقہ یذالپچایا ای
قصہ آکھ کے شیخ صنعاں والا، دردمنداں دادرد جگایاای
فیر عشق نیرنگ دی مثنوی نوں،وچ ھند زبان بنایا ای
ھن آکھ کے قصہ منصور والا، پنج گنج کیتے ذرا لئے ساھے
درد مند ناھیں کوئی پڑھن والا، لکھن ھار ناھیں کوئی مرد چاھے

۹۔ سخی خواص خاں

اس کتاب میں سخی خواص خاں کی بہادری وشجاعت، انصاف پسندی اوراس کی زندگی کے حالات و واقعات پیش کئے گئے ہیں جو کہ شیر شاہ سوری کی ایک کنیز کا بیٹا تھااور ترقی کرتے ہوئے فوج کا جرنیل بن گیا تھا۔ یہ کتاب بھی میاں صاحب نے پنجابی شاعری کی مشہور صنف سی حرفی کی صورت میں ہی تحریر کی ہےاور۱۲۸۲ ہجری کی یادگار ہے۔سخی خواص خاں کے کردار میں بھی انہوں نے منصور کے کردار کی طرح جانفروشی کی روایت کی علمبرداری کی ہے۔سخی خواص خان کی زندگی اور شہادت کے کارنامے تاریخ رہتاس میں بھی ملتے ہیں۔

نمونہ کلام

غرق کراں اوس ملک نوں جی جتھے قھر دی نظر دے نال ویکھاں
ھووے جو باغی کراں پکڑداغی، سردشمناں دے پائمال ویکھاں
کلچیٹ دی چبٹ کی نال بازاں جھلے لونبڑی شیر دی جھال دیکھاں
کُھری مَت محمدا نار دی ھے اوھدا کی جواب سوال ویکھاں

ترجمہ:

''میں جس ملک کی طرف قہر کی نظر سے دیکھوں، اسے غرق کرڈالتا ہوں۔ جو باغی ہوا سے پکڑ کر سخت سزا دیتا ہوں اور دشمنوں کے سروں کو پائمال کر دیتا ہوں۔ کلچیٹ باز کے ساتھ کیا مقابلہ کرے گا۔ لومڑی شیر کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔ عورت کی عقل ہمیشہ پاؤں کی ایڑی میں یعنی ناقص ہوتی ہے۔ اس سے کیا سوال و جواب کروں۔''

۱۰۔ مرزا صاحباں

مرزا صاحباں پنجاب کی ایک مشہور رومانی داستان ہے جسے پنجابی زبان کے بہت سے شاعروں نے لکھا ہے۔ اور سب سے زیادہ شہرت پیلو اور حافظ برخوردار نے حاصل کی ہے۔ میاں صاحب نے بھی اپنے ان دونوں پیشروؤں کی شہرت و مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ۱۲۸۸ھ کو یہ داستان نظم کی۔

یہ قصہ پُر صنعت اور بدائع معنوی و لفظی تلازمات کے لحاظ سے بے نظیر ہے۔ میاں صاحب نے اس قصہ میں پنجاب کی تہذیب و ثقافت کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ یہ کتاب شروع سے آخر تک صنائع بدائع پر مشتمل ہے۔ صنعت تجنیس، صنعت ایہام، صنعت مقلوب اور بے شمار ذومعنی الفاظ اس کتاب کی جان ہیں۔ یہ کتاب آپ کے مخصوص انداز فکر و فن کی آئینہ دار ہے۔ مثلاً

بل بَل گئے بَل بَل والے لنگ لنگ دے لنگ سمندکیتا

یہاں بل کے معنی بلکہ، جل گئے، طاقت والے ہیں جب کہ لنگ کے معنی شرم و حیا، تنگ و ناموس اور لنگڑا کے ہیں۔

یہ قصہ اس سے قبل کئی شعراء نے لکھا ہے۔ لیکن میاں صاحب ان پر کئی اعتبار سے سبقت لے گئے ہیں۔ دو باتوں کا ذکر اُنہوں نے خود کیا ہے:......

مدح حُسن دی وچہ تے درداندر میں تھیں جاوندے ناہ ھدار کیتے

(حسن کی مدح اور درد کے بیان میں مجھ سے ادھار نہیں ہو سکتا)

یہی دو خوبیاں اس قصے کی جان ہیں۔ اس میں مروّجہ روایت کے مطابق صنائی کا استعمال بھی ہے۔ مخصوص صنعت تجنیس کے استعمال پر صنائی کے سلسلے میں میاں صاحب کا ارشاد ہے۔

بندہ زور جے لاوندا صنعتاں تے گھٹ لبھدا معنی بھان والا

میرے قفل نوں لاوندااوہ کنجی شاگرد ھوندالقمان والا

(اگر بندہ صنعتوں پر زور لگاتا، تو معنی ڈھونڈنے والا کم ملتا۔ میرے قفل کو چابی وہ لگاتا، جو لقمان کا

شاگرد ہوتا)۔

فنی اعتبار سے جس شاعر سے وہ زیادہ متاثر ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ وارث شاہ ہے۔حتیٰ کہ بحر تک ہیر وارث شاہ کی ہے۔

اک گھٹ ویئیں اوس جاموں پاوے رونقوں نظم سنگار سایاں
وارث شاہ دی محفلوں دیھہ کاسا اس بے وارث خاکسار سایاں
احمد یار قادر میری نظم اتے کھن آفریں سو ھزار سایاں
فضل شاہ بلند لَوا اگے درویش تھیں پھل گزار سایاں

ترجمہ:

''اے خدا! مجھے وارث شاہ کے جام سے ایک گھونٹ پلاؤ۔ تا کہ میری نظم کو رونق اور سنگار حاصل ہو، وارث شاہ کی محفل سے اس بے وارث خاکسار کو ایک کاسہ عطا کر احمد یار اور قادر یار میری نظم پر سو آفرین کہیں اور فضل شاہ بلند لوا کے سامنے مجھ درویش کے پھول پیش کر''

اس خواہش سے پتہ چلتا ہے کہ وہ وارث شاہ سے فیض یاب ہو کر دوسروں سے محض آفرین حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔میاں صاحب نے وارث شاہ کی روایت سے بھر پور فائدہ اٹھایا ہے۔لیکن تقلید محض سے دامن بچایا بھی ہے۔وہ اپنے منفرد انداز بیان سے دست بردار نہیں ہوئے۔

میں تھیں کسے دی ریس نہ راس آوے رس اپنی ھی مینوں رسدی ھے
کاھنوں شعر میں سکھناں ھورناں تھیں نگہ پیر دی جے پئی وسدی ھے
گھر اپنے دا رُکھا کھان چنگا منگ کھاوناں مثل تے پھس دی ھے
جھڑی اپنے گھر پلا کھاوے، کم بخت گولی کِتے نسدی ھے

ترجمہ:

''مجھے دوسروں پر رشک کرنا راس نہیں آتا، مجھے اپنا انداز ہی راس ہے، میں کس لئے دوسروں کی تقلید کروں جب کہ مجھ پر میرے پیر کی نگاہ ہے۔اپنے گھر کا روکھا سوکھا کھانا اچھا ہے۔ مانگ کر کھانا بھوسے کی مانند ہے۔جس باندی کو گھر میں کھانے کو پلاؤ ملے وہ باہر کا رُخ کب کرتی ہے؟(باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے)۔''

ان اشعار میں بڑے خوبصورت انداز میں اپنی ذاتی تخلیقی صلاحیتوں پر اعتماد کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے مرزا صاحباں میں پیلو یا حافظ برخوردار کے انداز کی پرچھائیں تک دکھائی نہیں دیتی۔انہوں نے فضل شاہ کے نکتہ نظر سے واضح طور پر اختلاف کرتے ہوئے مرزا کے کردار کو بے داغ قرار دیا ہے۔

مرزے صاحباں دا قصہ آکھنے تھیں فضل شاہ هوراں انکار کیتا
روڑا راء بھی راء دوڑائیکے تے اس کم ولوں ذرہ عار کیتا
مرزے کھرل دے عشق نوں نقص رکھن جنھاں عقل دا نہ شمار کیتا
جیویں شاہ منصور دا عالماں نے معلوم ناهیں اسرار کیتا
سر دے کے سِرنوں لے گیا جاندا نس تے کم خوار کیتا
کُڑی بالغے اُوس نوں آپ دتا محرم اپنا کراسوار کیتا
وچہ جنگلیں ماریا حق اوتے نالے قتل اوهنوں تلوار کیتا
نالے صاحباں اوس دی قید هوئی لوٹی دشمناں هر هتهیار کیتا
ناقص عقل بندے قصہ آکھناں سی بهلا تدجے دوستاں پار کیتا
انصاف تے عفو محمدا نے هر مرد تهیں طلب هنجار کیتا

ترجمہ:

''مرزا صاحباں کا قصہ کہنے (لکھنے) سے فضل شاہ صاحب نے انکار کیا۔ روڑے رائے نے بھی اپنی رائے دوڑا کر اس کام کو عار سمجھا۔ مرزے کھرل کے عشق میں وہ لوگ نقص نکالتے ہیں جنھوں نے غور و تدبر سے کام نہیں لیا۔ جیسے شاہ منصور کا عالموں نے اسرار معلوم نہیں کیا۔ مرزا سر دے کر بھید پا گیا۔ اگر بھاگ جاتا' تو ذلیل و خوار ہو جاتا۔ بالغ لڑکی نے خود اپنا آپ اس کے سپرد کیا۔ اپنا محرم بنا کر اپنے ساتھ سوار کیا۔ وہ جنگل میں حق پر مارا گیا۔ اور تلوار سے قتل کیا گیا۔ اس کی صاحباں قید ہوئی۔ دشمنوں نے اس کا سارا سامان لوٹا۔ مجھ جیسے ناقص عقل والے انسان یہ قصہ بیان کرنا تھا' شاید اس لئے اس کی طرف دوستوں نے دھیان نہ دیا۔ میں ہر شخص سے انصاف اور عفو کا طلب گار ہوں۔''

ان اشعار سے مرزے کے کردار کے بارے میں میاں صاحب کا موقف بالکل واضح ہے۔ ان کی نگاہ اس کے کردار کی پاکیزگی اور استقامت پر مرکوز ہے یہی وجہ ہے کہ انہیں یہ کردار بھی عزیز ہے۔ اس طرف حافظ برخوردار، پیلو، اور دیگر شعراء نے کوئی توجہ نہیں دی۔ دوسری اہم حقیقت جس کی طرف انہوں نے توجہ دلائی ہے، وہ عورت کا اپنی شادی کے بارے میں آزادی رائے کا حق ہے۔ جسے قرآن و حدیث میں واضح الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے لیکن اس حق کے راستے میں بھی کئی رکاوٹیں پیدا کی گئیں نسوانی حقوق کی وہ روح ختم ہو گئی جس کا علمبردار اسلام ہے۔ میاں صاحب عورت کی حق میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔
صاحباں اپنی جان کا نذرانہ دے کر سماج کی قیود کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس کی اس جائز بغاوت کو انہوں نے حق قرار دے کر لاکھوں عورتوں کے حقوق کی پاسداری کی ہے۔ پیر ماہنیاں سے مرزا کی گفتگو میں اس

کے کردار کا جو پہلو دکھایا گیا ہے وہ اس کا عشق صادق ہے۔

"او گنہار بندے اسیں لالچی ہاں آپے من لئی تقصیر ھے جی
پر جنب پلیتیوں پاک پنڈا بندا کام دا نہ اسیر ھے جی
میری صاحباں نال پریت سُچی سچا عشق میرا گلو گیر ھے جی
اساں کام دے کام نہ گام پایا' عشق کام میرے وچ شیر ھے جی
نار نار تے میں ہاں ککھہ توڑے اوھدے نور وسایا نیر ھے جی
رب ککھہ تے رحم دا مینہہ پایا تیرے عشقدیدی تاثیر ھے جی
گلے ککھ بجھا وندے اگ تھوڑی گل عجب ناھیں سدی تیر ھے جی
نھیں جنب محمداؔ بدن میرے بولاں سچ جے وقت اخیر ھے جی

ترجمہ:

''ہم اوگنہگار لوگ لالچی ہیں، میں نے اپنی تقصیر سن لی ہے، لیکن جب اور آلودگی سے میرا جسم پاک ہے۔ بندہ کام کا اسیر نہیں ہے۔
میری صاحباں کے ساتھ محبت سچی اور پاکیزہ ہے۔ میرا عشق پاکیزہ ہے، ہم نے لذت پرستی تلاش نہیں کی۔ بلکہ عشق کی دودھ جیسی شیرینی سے ہم سرشار ہیں۔ نار آگ ہے اور میں تنکہ ہوں۔ لیکن اس کے نور نے روشنی بخشی ہے رب نے تنکے پر اپنے فضل وکرم کی بارش کی ہے۔ یہ عشق کی تاثیر ہے۔
بوسیدہ تنکے آگ کم ہی بجھاتے ہیں، یہ بالکل کھری اور سیدھی بات ہے۔ میرا جسم جنبی نہیں ہے، یہ میرا آخری وقت ہے۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں''۔

مرزا کے کردار کی پاکیزگی کے علاوہ اس کی دوسری خوبی جو ظاہر کی گئی ہے۔ وہ اس کی جاں نثارانہ شفتگی اور موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے کا جرات مندانہ ڈھنگ ہے۔ وہ سینہ تان دشمنوں کے درمیان کھڑا ہر وار ہنستے ہوئے سہتا ہے۔ لیکن راہ فرار اختیار نہیں کرتا۔ وہ جرات سے دشمنوں کو للکارتا ہے۔

اسیں کھرل اصیل نہ کنڈدئیے، سو ٹکڑے شیر مثال توڑے
ویری ٹکڑے ٹکڑے کر کے جیو میرے تکڑے جاونے جال توڑے
جاواں سٹ تے تخم اصیل داناہ' سلن لان وانگوں سونبے نال توڑے
سچا سنگ نہ سانگ بنا آیوس ڈرسانگ تھیں دیواں چال توڑے
اس دیھی تے انت ھے خاك ھونا نت کتنی پال توڑے
اك یار دی حاضری چاھئے جیو لکھہ سیس هوون پا مال توڑے

ترجمہ:

''ہم عالی نسب کھرل میدان میں کبھی پیٹھ نہیں دکھاتے، چاہے ہم سو ٹکڑے ہو جائیں۔ خواہ دشمن ہمیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے تکا بوٹی کردے۔

اگر میں صاحباں کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں تو میں اپنے باپ کے نطفے سے نہیں ہوں۔ اگر جسم چھلنی ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ اگر میں مکر و فریب سے فرار ڈھونڈوں تو میرا عشق سچا عشق نہیں۔

اس جسم کو آخر خاک ہونا ہے خواہ اسے کتنا ہی سنبھال سنبھال کر رکھیں۔ اصل چیز تو یار کے حضور حاضری ہے چاہے لاکھوں سس کٹ جائیں۔''

مرزا کے کردار میں جرات اور استقامت کے علاوہ نرم خوئی اور دلجوئی کا نمایاں وصف بھی دکھائی دیتا ہے۔ میاں صاحب نے اسے ''گرم دم جستجو'' ہی نہیں بلکہ ''نرم دم گفتگو'' بھی ظاہر کیا ہے۔

مرزا جھنگ اندر کرے سیر کھلا' جیویں شیر پھرے وچ بیلیاندے
یوسف مصر اندر رهن آلتها پهلوان جیویں وچه میلیاں دے
جیویں پنکھیاں وچه هے باز هوندا تیویں وچ سی راج گهیلیاں دے
شکل عقل صورت سیرت وچ نرمی مٹھا نرم مانند سی کیلیاں دے

ترجمہ:

''مرزا جھنگ کے اندر شیر کی طرح آزادی سے سیر کرتا تھا۔ یوسف مصر کے اندر یوں آ گیا تھا۔ جیسے میلوں ٹھیلوں میں پہلوان۔

جیسے پرندوں میں باز، ویسے ہی وہ اپنے ساتھیوں میں سردار تھا۔ وہ شکل عقل صورت سیرت میں بلند مرتبہ ہونے کے علاوہ کیلوں کی مانند نرم بھی تھا)''

میاں صاحب نے ''ترنجن'' کا جو تصور دیا ہے وہ شاہ حسین کے ہاں بھی نہیں ملتا۔

گهر بیبودے آکے بیٹھ دی هے نت فجرنوں چرخڑا ڈاه میاں
پهیڑے بیٹھ کے خاص توکلے دے پنجے پنجیوں وهم کپاه میاں
گوهڑے غم هوئے اوهدے هتھ گوهڑے وٹے پونیاں اوه پون آه میاں
چرخه چرخ دماغ تے پڑا اوهدا پیچ پیچ دلیل تباه میاں
دُکھ ترکلا ماهل امید لمّی پئی پھیر دی واهو واه میاں
مُنّے گڈیاں پنج حواس تائیں قائم رکھ دی سی آگاه میاں
چمڑا سلیّا دردے ترکلّے تے تند پریت دی کڈھ دی واه میاں
چهلی حب دی بهر کے خوب طرح پچهی من دی رکهدی لاه میاں

ترجمہ :

''(وہ ہیو کے گھر میں صبح سویرے چرخالے کے بیٹھ جاتی تھی اور توکل کے ''پیہڑے'' پر بیٹھ کر'' پنجے'' سے وہم وگمان کی کپاس دھنتی جاتی تھی۔

اس کے غم بکھر کر'' گوہڑے گوہڑے'' ہو گئے۔ اس کے رنگدار ہاتھ پونیاں کاتتے تھے۔ جو ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتی تھیں۔

اس کے دماغ کے چرخے پر اس کا'' پڑا'' تھا۔ بیچ بیچ تباہ شدہ دلیل کی مانند تھا،

اس کا ترکلا دُکھ تھا اور مالہ لمبی امید تھی، جس کو وہ پھیرتی تھی۔ اور'' سنے گوڈیاں'' یعنی پانچوں حواس کو قائم اور بحال رکھا ہوا تھا۔

اس نے درد کے ترکلے پر چمڑا کو سل دیا اور اس درد کے ترکلے سے وہ پریت (محبت) کی تند نکالتی تھی۔ اور اس کو خوب پھیر کے محبت کی چھلی بناتی اور اس من کی چھی (یعنی ٹوکری میں) اتار اتار کر رکھتی تھی)۔''

یہ تمام اصطلاحیں ترنجن سے متعلق ہیں۔

قصے کے آخر پر شاعر نے اپنی چند کتابوں کے بارے میں بتایا ہے۔

میرے شعر دے سار نوں سو جانے جس عشق دا سار وپار ھے جی

سارا فقر دی رمز دے نال بھریا کِتے سِپ موتی اسرار ھے جی

میری عاجزی ناقصی دیکھ کے تے لطف پیر والا ہویا یار ھے جی

ایس خشك زمین نوں بھاگ لایوس کلر شور ہویا گلزار ھے جی

عقل دُو تیاندی جھڑے چاك ہوندے جدوں باھر دیندی چمکا رھے جی

ویکھ سیف ملوکے دے وچ قصے رنگ رنگ دا شعر اظہار ھے جی

سوھنی بوھت سوھنی دکھوں من موھنی کیتا شعر جو پھلڑے دار ھے جی

تحفہ پاك رسولؐ تے تحفہ میراں منصور شاہ دا ذکر انکار ھے جی

صنعان دا ذکر بیان کیتا پھر صنعتاں دا بازار ھے جی

فرھاد دے درد نوں یاد کیتا جیوں راویاں تھیں اخبار ھے جی

ھندی عشق نیرنگ نوں نظم کیتا نالے فقر والا گلزار ھے جی

نالے خواں خاص دا خوب قصہ ہویا نظم دے وچ تیار ھے جی

ھُن صاحباں صاحباں واسطے بھی کیتی کھرل دے نال سوار ھے جی

باراں گنج ونڈے یاراں رنج ناھیں اجے طبع جوش بخار ھے جی

دتے پیر نے شعر دے گنج مینوں ھر دُر اوھدا شاھوار ھے جی

۱۱۔ ہدایت المسلمین

پہلے اس کتاب کا نام ''ردوہابیت'' رکھا گیا تھا کیونکہ یہ کتاب عبدالوہاب نجدی کے افکار وعقائد کی تردید کرتی ہےاور بعد میں ''ہدایت المسلمین'' کر دیا گیا۔میاں صاحب نے ۱۲۹۷ھ میں یہ کتاب لکھ کر عبدالوہاب نجدی کے افکار کا ابطال کیا ہے۔اوران کے افکار وعقائد کی خوب قلعی کھولی ہے۔اپنے موقف کوتقویت دینے کے لئے مستند کتابوں سے حوالے دیئے گئے ہیں۔یہ کتاب میاں صاحب کے مذہبی اعتقادات کو جاننے کے لئے ایک اہم ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔اس کتاب کے بارے میں ان کا کہنا ہے۔

قصد میرا اس نظم کرن تھیں ناھیں شعر وکھاون
نہ کوئی بحث جدال کسے سنگ نہ کجھ ویر کماون

ترجمہ:

''اس نظم سے میرا مقصد شاعرانہ کمال دکھانا نہیں۔نہ کسی سے بحث وجدال مقصود ہے اور ہی کسی سے دشمنی۔''

اس انکساری کے باوجود یہ بات قابل ذکر ہے کہ میاں صاحب نے عربی آیات واحادیث اور فقہی مسائل کو جس خوبصورتی سے اپنے اشعار میں سمویا ہے'وہ شاعرانہ قدرت اور دینی بصیرت کے بغیر ممکن نہ تھا۔اس میں دینی اور فقہی مسائل کے بیان میں بھی سادگی اور شیرینی کو برقرار رکھا گیا ہے۔''تحفہ میراں'' میں صرف فضائل اور مناقب کو نمایاں کرنا مقصود تھا۔لیکن اس تصنیف میں فریق مخالف کے دلائل کا تجزیہ اور ابطال بھی پیش نظر تھا۔اس مقصد میں کامیابی کے لئے انہوں نے پورے دینی ورثہ کو کھنگالا ہے۔یہ کتاب ایک نیاز مند محمد بخش''متوطن پوٹھوہار علاقہ بیول کی فرمائش پر لکھی۔

کتاب کے آخری ورق میں یوں ارشاد فرمایا ہے۔

وچ پـٹھـوار عـلاقـہ بیـول پـنـڈ اک نـام پـنـڈوڑی
نـام مـحـمـد بـخـشؒ اک عـالم جس ایھہ خـواھش لوڑی

۱۲۔پنج گنج

پنج گنج میں عموماً پانچ سی حرفیاں ہوتی ہیں۔لیکن آپ نے اس میں سات سی حرفیاں اور ایک بارہ ماہ شامل کیا ہے۔پانچ سی حرفیاں تومسلسل ایک ہی روایتی بحر میں ہیں۔لیکن چھٹی سی حرفی چھوٹی بحر میں تیز

انداز میں پڑھی جانے والی تحریر فرمائی ہے۔ دراصل یہ سی حرفی بحضور سید عبدالقادر جیلانیؒ ان کے معتقد مرید کی فریاد کی صورت میں ہے۔ اور وہ مرید خود میاں صاحب ہیں، ساتویں سی حرفی "سسی پنوں" کے نام سے ہے اور اس کے بعد ایک بارہ ماہ ہے۔ سی حرفیوں کے مضامین زیادہ تر صوفیانہ اور فنا سے متعلق ہیں۔ پہلی پانچ سی حرفیوں کا موضوع دنیا کی بے ثباتی، عقبیٰ کا دوام، تصوف و معرفت اور وحدت الوجود ہے۔

نیز ہجر و فراق، پند و نصائح اور مرشد سے عقیدت کے موضوعات بھی ان میں شامل ہیں۔ یہ چھوٹی سی لازوال کتاب 1304ھ کی تصنیف ہے۔ اس کے اشعار کی تعداد 416 ہے۔

ث۔

ثابتی نال جے نظر کیجے دوئی دور ہوندی دوئی دُور ہوندی
جتھے ھکی دا پرتو آوندائے اوتھے نور ظہور کوہ طُور ہوندی
سچ آکھیاں تے بھانبڑ مچدائے گل دانگ منصوؐر مشہوؐر ہوندی
پانی وچ محمدؐا بڑبڑی جے آپے اُٹھدی تے آپے چُور ہوندی

ترجمہ:

"اگر بنظر غائر دیکھیں تو دوئی دور ہو جاتی ہے۔ جہاں ایک کا پرتو پڑے وہاں کوہ طور سا نور دکھائی دیتا ہے۔ سچ کہنے سے تو طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور منصور کی بات دور دور تک شہرت پا لیتی ہے۔ غور سے دیکھیں تو اے محمد! پانی میں حباب خود ہی اٹھتا ہے اور خود ہی ٹوٹ جاتا ہے۔"

ذ۔

ذرا نہ ڈولیں سسیئے لگانیوں نہ توڑیں تے ھتھ جوڑیں
غیر ولوں منہ کجی رکھیں مگر پنوں دے دوڑیں بوھتی لوڑیں
الم اعھد الیکم کھندا غیر اندی گل موڑیں سنگ نہ پھوڑیں
پائیں قول اقرار محمدؐ پچھا مول نہ چھوڑیں، کیچم توڑیں

ترجمہ:

"اے سسی اگر محبت کا عہد کر لیا ہے تو اب ذرا نہ ڈولنا اپنے عہد کو نہ توڑنا قائم رہنا۔ محبت سے منہ نہ موڑنا۔ غیر سے خود کو چھپائے رکھنا، پنوں کے پیچھے دوڑتے رہنا، اور اس کی جستجو اور تلاش جاری رکھنا۔ الم اعھد الیکم کا تقاضا تو یہ ہے کہ تو غیروں کو چھوڑ کر اپنے محبوب سے پیار نبھائے اپنے قول وقرار پر قائم رہے محبوب کی تلاش جاری رہے اور اپنے عہد و پیمان پر ثابت قدم رہے۔"

۱۳۔ہیر رانجھا

یہ میاں صاحب کی آخری تصنیف ہے۔ میاں صاحب نے اسے 1315ھ میں قلم بند کیا۔ یہ بچپن میں لکھی گئی تھی اس وقت میاں صاحب کی عمر 68 برس تھی۔ یہ کتاب اس عنوان کے مکمل قصہ پر مشتمل نہیں ہے بلکہ ایک چٹھی ہے جو ہیر کی طرف سے رانجھا کے نام ہے اور اس کتاب کا نام ''چٹھی ہیر رانجھا'' ہے۔ آج کل یہ کتاب ''شیخ صنعان'' کے ساتھ شائع ہو رہی ہے۔ اس میں 121 رباعیاں اور ایک سی حرفی کے تیس مخمس شامل ہیں۔ اس لحاظ سے اس کتاب کے کل اشعار کی تعداد 315 بنتی ہے۔

ہیر رانجھا میں میاں صاحب نے صوفیانہ فکر کو سامنے رکھا ہے۔ یہاں ان کا انداز پہلے کے شعراء سے مختلف ہے انہوں نے قصے کا آغاز وہاں سے کیا ہے۔ جب ہیر کا خط برہمن لے کر رانجھے کے پاس آتا ہے۔ اس کے پیغام میں سوز دروں اور محبت کی حدت واضح اور نمایاں ہے۔

میاں صاحب نے قصے کا آغاز ہی آتش ہجر سے کیا ہے۔ ہیر کا خط ہجر و فراق کا نمونہ ہے۔

رب رکھیاں پاک امانتاں نے، رکھیں فکر نہ اس دا یار میرے
تیرے فکر تھیں بہت لاچار ہویاں برس برس ہے لیل نہار میرے
اندر پئی اکلڑی گلنیاں میں سیاں سنگ ناہیں راز دار میرے
آدمی ہوش محمدؐ نام لیواں اوہو نام اوتار دا بھار میرے

ترجمہ:

''اللہ پاک نے تیری پاک امانت کو محفوظ رکھا ہے۔ اے دوست اس بات کا فکر اور اندیشہ نہ کرنا۔ میں تیری فکر میں بہت لاچار ہو چکی ہوں۔ ایک ایک دن اور ایک ایک رات برس برس برابر ہے۔ میں اندر ہی اندر گھلی جا رہی ہوں، میرا کوئی دوست اور راز دار نہیں، صرف تیری محبت کے سہارے یہ بوجھ برداشت کر رہی ہوں۔''

۱۴۔ گلزار فقر

اس کتاب کا ذکر میاں صاحب نے اپنی مشہور تصنیف ''مرزا صاحباں'' اور ''قصہ سخی خواص خاں'' کے آخر میں کیا ہے مگر اس کتاب کا کوئی مطبوعہ یا مخطوطہ ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس لئے یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ یہ کتاب میاں صاحب کی طبع زاد ہے یا کہ کسی کتاب کا ترجمہ پیش کیا ہے۔

۱۵۔ تذکرہ مقیمی

میاں صاحب کی واحد منثور تصنیف جو فارسی نظم ونثر میں ہے اس میں انہوں نے حضرت پیرا شاہ غازی المعروف دمڑی والی سرکار کی سلسلۂ طریقت کے بزرگوں کے حالات اور کرامات کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انہوں نے اپنے خانوادے کے روحانی بزرگوں کے حالات لکھے ہیں۔اس کتاب میں بے شمار ایسے صوفیا اور بزرگوں کا تذکرہ محفوظ ہوگیا ہے جو شائد ہی کہیں اور مل سکے۔اصل کتاب تو طبع نہیں ہوئی البتہ اردو میں اس کا ملخص ترجمہ میاں صاحب کے مرید خاص ملک محمد ٹھیکیدار نے کیا تھا جو''بوستان قلندری'' کے نام سے ۱۹۳۰ء میں جہلم سے چھپا تھا۔''تذکرہ مقیمی'' میاں محمد بخشؒ کی ان کتابوں میں سے ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ یہ 1274ھ میں تحریر کی گئی۔اس کا قلمی نسخہ بھی دستیاب ہے۔ پروفیسر غلام حسین اظہر (مصنف 'میاں محمدؒ۔شخصیت اور فن) نے 1980ء میں یہ قلمی نسخہ اس وقت دیکھا تھا جب میاں صاحب کے اہلِ خاندان نے اسے اوقاف کے خلاف مقدمے میں بطور ثبوت پیش کیا تھا۔ پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب میں اس کے پہلے صفحہ اور آخری صفحہ کا عکس بھی شائع کیا ہے۔ ''تذکرہ مقیمی'' ایک اعلیٰ درجہ کا ادبی شاہکار بھی ہے'اس میں جوادبی جوہر کھل کر سامنے آیا ہے۔وہ فارسی گوئی پر کمال دسترس ہے۔اس میں شاعرانہ کمالات جا بجا دکھائے گئے ہیں۔

میاں محمد بخشؒ کی ان متذکرہ تصانیف وتالیفات کے علاوہ بھی بہت سی نظمیں، دوہے اور متفرق اشعار وغیرہ مل جاتے ہیں جن کو آج تک باقاعدہ کسی کتابی صورت میں نہیں لایا جاسکا۔میاں صاحب کا بہت سا متفرق اور غیر مطبوعہ کلام آج بھی ادھر ادھر ان کے مریدوں، دوستوں عزیزوں کے گھروں میں پڑا دیمک کی نذر ہورہا ہے۔وہ کلام زیادہ تر پنجابی اور فارسی زبانوں میں لکھا گیا ہے۔

سیف الملوک

(پنجابی شاعری کا شاہکار)

قصہ سیف الملوک الف لیلہ سلسلے کی داستان ہے' جو کسی قصہ گو نے عہد وسطیٰ کی محفلوں میں سنانے کے لئے وضع کی۔ یہ داستان مصر کے ایک شہزادہ سیف الملوک اور ایک پری بدیع الجمال کے عشق کی کہانی ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح یوں ہے کہ بدیع الجمال کے حصول کے لئے سیف الملوک کی سعی و کاوش کی سرگزشت ہے۔ مشرقی ادب میں یہ داستان بہت مقبول رہی ہے۔ فارسی' اردو' ترکی' سندھی' بنگالی' پشتو اور دیگر زبانوں میں یہ قصہ منظوم و منثور صورتوں میں موجود ہے۔ اردو میں اسے ملا غواصی نے ۱۰۳۶ھ۔ ۱۶۲۵ء اور لطف علی بہاولپوری نے ۱۱۹۷ھ میں سرائیکی میں نظم کیا۔ پنجابی میں میاں محمد بخشؒ سے پہلے احمد یار مرالوی نے اسے نظم کیا۔ میاں محمد بخشؒ نے ۱۲۷۹ھ میں اس قصے کو نظم کر کے ایک نئی جہت عطا کی۔ انہوں نے اپنی فنی مہارت' وسعت مطالعہ و مشاہدہ اور فکری بالیدگی سے ایک باکمال شاہکار بنا دیا۔ پنجابی شاعری میں ان کی شہرت کا باعث قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال ہے۔ اس پذیرائی کی بنیادی وجہ یہ ہے انہوں نے محض داستان کے واقعات کو بیان نہیں کیا' بلکہ اپنے خون جگر کی آمیزش سے اسے ذاتی تجربات و مشاہدات اور صوفیانہ رموز و معارف کا آئینہ بنا دیا۔

قصے ہور کسے دے اندر درد اپنے کجھ ہوون
بن پیڑاں تاثیراں ناہیں' بے پیڑے کد روون
درد لگے تاں ہائے نکلے کوئی کوئی رہندا جر کے
دلبر اپنے دی گل کیجئے ہوراں نوں منہ دھر کے
جس وجہ گجھی رمز نہ ہووے دردمنداں دے حالوں
بہتر چپ محمد بخشا سخن اجیہے نالوں

ترجمہ:

''کسی اور کے قصے میں اپنے دُکھ درد کا بیان ہوتا ہے' بغیر سوز کے کلام میں تاثیر کہاں' بن

درد کب کوئی روتا ہے؟ درد اُٹھے تو ہائے منہ سے نکل جاتی ہے۔ بہت کم لوگ خاموشی سے
درد کو برداشت کرتے ہیں۔ دوسروں کے پردے میں اپنے دلربا کی بات کی ہے۔ (اپنے
محبوب کی بات بھی کی جائے تو کسی اور محبوب کو سامنے رکھ کر کرنی چاہئے)۔
جس شاعری میں گہری رمز اور دردمندوں کا سوز و گداز پنہاں (پوشیدہ) نہ ہو تو ایسے کلام
اور شعر سے تو محمد بخش چپ رہنا ہی بہتر ہے۔ (چپ ہی بھلی)۔"

میاں صاحب نے اس قصے میں سوز و گداز اور معروفت کے رموز کو شامل کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی اور شیرینی کا بھی بطور خاص خیال رکھا ہے۔ انہوں نے مجاز کے پردے میں گہرے صوفیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ تاکہ خواص اور عوام دونوں ہی اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔

چونکہ میاں محمد صاحب کا تصوف سے گہرا لگاؤ ہے اس لئے اس میں تصوف کے اسرار و رموز کا بے پناہ ذخیرہ ملتا ہے۔ میاں محمد بخش کا مقصد محض اس داستان کو نظم کرنا ہی نہیں تھا بلکہ اس کے ذریعے وہ تصوف و عرفان اور سلوک و معرفت کے رموز و نکات بیان کرنا چاہتے تھے۔ بعض عقیدت مندوں کا کہنا ہے کہ میاں صاحب کا مقصد صرف تصوف کے مسائل بیان کرنا تھا۔ طالب و مطلوب کو سیف الملوک اور بدیع الجمال کے فرضی نام دیئے گئے ہیں۔ دیووں پریوں سے دنیا کی خواہشات اور شیطانی عناصر کی طرف اشارہ ہے جو ہر وقت انسان کو گمراہ کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ اس لئے اس کے ہر شعر کو تصوف کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے چند لوگ اس قصے کی حقیقت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔

قصے کی تحریک

میاں صاحب نے سیف الملوک اپنے بڑے بھائی اور سجادہ نشین دربار پیرا شاہ غازی کے ایماء پر لکھی۔

سیف ملوکے دی گل اونہاں کسے کتابوں ڈِٹھی
اس قصے دی طلب پیو نے میں ول کردے چٹھی

ترجمہ:
"انہوں نے سیف الملوک کا قصہ کسی کتاب میں دیکھا۔ اس قصے کی طلب کرتے ہوئے
مجھے چٹھی ڈالی......(خط لکھا)"

ایہہ مضمون چٹھی دا آہا قصہ جوڑ شتابی
چُن چُن سخن پروویں تسبیح موتی سلّ خوشابی

ترجمہ:

''چٹھی کا مضمون یہ تھا کہ یہ قصہ فوراً شعروں میں لکھو۔ تم سخن کے موتی اس طرح چن چن کر پرودو کہ جس طرح چمکدار موتی کسی تسبیح میں پروئے ہوتے ہیں۔''

میاں صاحب اپنے برادر بزرگ کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی سخن فہمی اور ذوق شعر کے معترف تھے' جیسا کہ خود فرماتے ہیں۔

سخناں دی اوہ قیمت پاوے شعر میرے خوش لیندا
اوس صراف اگے جو تردا سو خزانے پیندا

ترجمہ:

''میرا پیرومرشد میرے کلام کی خوب قدر و قیمت جانتا ہے۔ وہ شعر شناس ہے' وہ میرے شعر سُن کر خوش ہوتا ہے' اس پارکھ کے آگے جو پورا اترتا ہے اسی کو خزانے میں شامل کر لیتا ہے۔''

اس وقت تک میاں صاحب نے قصوں کی حد تک ''سوہنی مہینوال'' اور ''شیریں فرہاد'' تحریر کئے تھے یا پھر ''نیرنگ عشق'' کا ترجمہ۔ چنانچہ اس ذمہ داری کو اٹھاتے ہوئے ان کی جو کیفیت ہوئی اس کا اظہار انہوں نے بڑے خوبصورت انداز سے کیا ہے۔

قصہ او کھا نالے لمّاں زور کمی پنڈ بھاری
ڈاھڈے دا فرمان نہ مڑدا روگی جند بچاری

ترجمہ:

''قصہ مشکل ہے اور طویل بھی ہے گویا زور کم اور گٹھڑی بھاری ہے۔ اس طاقتور کے فرمان کی حکم عدولی بھی نہیں کی جا سکتی۔ پھر میری جان بھی روگی اور بیچاری ہے۔''

برادر محترم کا یہ فرمان بھی تھا:

نکے قصے بیت سی حرفی کیہ ہویا تدھ لکھے
ایسے سویں تسیں بی میاں سخن کرن ھن سکھے
چھپڑیاں وچ تَر تَر ڈھوئی آندی وچ پوکھاں
یا دس زور طبیعت والا یا مڑ تائب ہوکھاں

ترجمہ:

''تم نے پہلے چھوٹے چھوٹے قصے لکھے ہیں تو کیا ہوا۔ بیت اور سرحرفیاں بھی بہت بنائی ہیں مگر ایک طویل داستان بھی تصنیف کرو۔ تم نے بڑی محنت سے پرموزوں اور دلکش شعر کہنا سیکھا ہے۔

پہلے تم نے چھوٹی چھوٹی چھپڑیوں (تالابوں) کو تیر کر دیکھا ہے۔ اب بڑی ندی (دریا) میں اتر کر دیکھو اور اپنا زورِ طبیعت دکھاؤ یا پھر شعر کہنے سے توبہ کر لو۔ (شاعری چھوڑ دو)''

چنانچہ انہوں نے ارادہ باندھا۔ حضرت پیرا شاہ کے دربار پر حاضری دی اور مدد مانگی اور یوں قلم رواں ہوا۔ اور اس طرح رواں ہوا کہ پنجابی ادب کا ایک عظیم فن پارہ وجود میں آ گیا۔

میاں محمد بخشؒ اس قصے کی غرض وغایت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

قصہ سیف ملوکے والا اس کارن ھُن کھناں

طالب ھمت کرکے چلے' روا نہ رکھے بھناں

یہ فکر پوری کتاب کے اندر رواں دواں ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ پیغام ہمت' دلیری' عزم اور ارادے کی پختگی کی ایک مسلسل پکار ہے' جو ہر پڑھنے اور سننے والے کو ایک نیا ولولہ بخشتی ہے۔

میاں محمد بخشؒ نے اپنی کتاب کی خود بھی تعریف کی ہے اور اس کی شہرت دوام کے لئے دعا کے ساتھ اپنی عاجزی کا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ سیف الملوک میں لکھتے ہیں۔

واہ واہ باغ ارم دا بنیاں دیویں رب بہاراں

ٹھنڈی تتّی واہ نہ لگوس رونق رھے ھزاراں

جے رب سچے رحمت کیتی رھسی باغ اُجالا

ھو کے خاک ھوئے گا عاجز باغ بناون والا

ترجمہ:

''سبحان اللہ! کیا خوب باغ ارم بن گیا ہے۔ خدا اسے بہاریں عطا کرے۔ اسے کوئی گزند نہ پہنچے اور ہزاروں رونقیں دیکھنا نصیب ہوں۔ اگر خدا کی رحمت ہوئی تو یہ باغ ارم (سیف الملوک) ہمیشہ لہلہاتا رہے گا۔ لیکن باغ لگانے والا عاجز ہو کے خاک ہو جائے گا......میاں صاحب نے جو باغ لگایا تھا وہ آج سوا سو سال گزر جانے کے بعد بھی اسی طرح تر و تازہ پر رونق اور سرسبز و شادابی سے لہرا رہا ہے اور اس کی خوشبو سے آج بھی مردہ دلوں کے کنول کھل جاتے ہیں۔''

مقبولیت

اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی سیف الملوک کی مقبولیت میں فرق نہیں آیا۔ بلکہ روز بروز اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ میاں صاحب کو شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ اس لئے انہوں نے پنجابی زبان کے دوسرے صوفی شعراء کی طرح شاعری ہی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور اس وقت کی عشقیہ داستانوں کو خصوصاً اپنا موضوع بنایا ہے جو اس زمانے میں عوام میں مقبول اور مروج تھیں۔ یوں تو میاں محمد بخشؒ نے

بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔مگر ان کو زندہ جاوید بنانے والی ان کی کتاب ''سفرالعشق'' (سیف الملوک وبدیع الجمال) ہے اس کتاب میں اُنہوں نے صرف ایک عشقیہ داستان ہی قلمبند نہیں کی بلکہ جگہ جگہ اپنے عقیدوں اور خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔اس میں زمانے کی سرد مہری اور ناقدری کا گلہ بھی ہے۔فن کی سچائی کا اظہار بھی ہے اور انسانی دکھ درد کا احساس بھی ہے۔وہ اپنی اس کتاب میں درویش بھی نظر آتے ہیں ایک بلند پایہ شاعر بھی دکھائی دیتے ہیں اور انسانی خوبیوں اور سچائیوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔زبان اور بیان کی خوبیاں' شاعرانہ صلاحیتیں' استعارے اور تشبیہات' اشارے وکنایے' روانی اور سلاست زور بیان اور مشاہدہ' احساس و ادراک' فنی خوبیاں اور سچائیاں' حقیقت ومجاز' غرض میاں محمد بخشؒ کی شخصیت جس طرح مکمل صورت میں سیف الملوک میں نمایاں ہے اس طرح کسی اور تصنیف میں سامنے نہیں آتی۔

میاں محمد بخشؒ اپنی منظوم داستان سیف الملوک کے واقعات' پلاٹ اور کرداروں کو معتبر اور مستند ثابت کرنے کے سلسلے میں کتاب کے ابتداء میں ''حکایت حسن میمندی کہ قصہ او پیدا وہویدا شدہ'' کے عنوان کے تحت ذکر کرتے ہیں۔

خبراں گھن کتاباں وچوں قصّہ جوڑ بنایا
واللہ اَعلم اوس زمانے کیونکر حال وہایا

ترجمہ:

''میں نے کتابوں میں سے واقعات لے کر پورا قصہ جوڑا ہے۔باقی اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس زمانے میں یہ کیونکر پیش آیا تھا۔''

ایک دوسرے عنوان ''در بیان اوصاف قصہ مذکور اوصاف شعر وکلام گوید والتماس پیش دانایان ایں فن شریف'' کے تحت لکھتے ہیں......

میں بھی بات عجائب ڈٹھی فارسیوں اخباروں

اور............

ملکاں تھیں منگوا کتاباں بات تمامی لوڑی

ترجمہ:

''میں نے یہ دلچسپ کہانی فارسی کی کتابوں میں سے لی ہے۔میں نے مختلف ملکوں سے کتابیں منگوا کر اور ان میں سے یہ تمام واقعات تلاش کئے ہیں۔''

میاں صاحب کا دعویٰ ہے کہ مجھے مختلف پریوں نے قصے اور کہانیاں سنائی ہیں ان میں سے جو باتیں میرے دل کو لگی ہیں وہ میں نے اس داستان میں شامل کر لی ہیں۔ان کا خیال ہے کہ سیف الملوک اور بدیع الجمال کی کہانی حقیقی اور سچی ہے لیکن اگر حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو اس داستان کا تاریخ یا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ایک خیالی داستان ہے۔ان سے پہلے اس نام سے کئی شاعروں نے

مختلف زبانوں میں داستانیں لکھی ہیں۔

سفر العشق میں تمثیلی رنگ

میاں محمد بخشؒ نے اپنی ۸۷ سالہ زندگی میں بے شمار کتابیں تحریر کیں اور اَن گنت دوہے واشعار کہے مگر ان کی تمام ادبی شہرت ان کی تصنیف پُرلطیف سفر العشق یعنی قصہ سیف الملوک کی رہینِ منّت ہے۔ ساری دُنیا اُنہیں آج صرف اسی کتاب کے مصنف کی حیثیت سے ہی جانتی ہے۔ میاں صاحب نے یہ کتاب ۱۲۷۹ھ بمطابق ۱۸۶۲ء کو تصنیف کی اور اس وقت ان کی عمر ۳۳ برس تھی۔ میاں صاحب نے اپنی اس تصنیف کو "سفر العشق" کے نام سے موسوم کیا ہے، جس طرح کہ وہ خود لکھتے ہیں......

بات مجازی رمز حقانی ون وناں دی کاٹھی
"سفر العشق" کتاب بنائی سیف چھپی وِچ لاٹھی
ناز نیاز تے سفر عاشق دا ایس قِصّے وِچ آیا
سفر العشق محمد بخشؒا نام دلیلوں پایا

ترجمہ:

"اس قصے میں مجازی بات کے اندر حقیقی رمز کو چھپا کر بیان کیا گیا ہے۔ میری لکھی ہوئی کتاب "سفر العشق" میں یہ لاٹھی میں چھپی ہوئی ایک تلوار ہے یعنی اس کے ظاہر کی بجائے باطن پر نظر رکھیں......"

اس قصے میں ایک عاشق کے سفر اور ناز و نیاز کا تذکرہ ہے اور اے محمد بخشؒ میں نے سوچ کر اس کا نام "سفر العشق" رکھا ہے، چونکہ سفر العشق میں شہزادہ سیف الملوک اور پری بدیع الجمال کے عشق کی داستان نظم کی گئی ہے۔ اس لئے اسی نام سے مشہور ہوگئی۔

میاں صاحب نے اس بات کا بھی دعویٰ کیا ہے کہ ان کی یہ پوری کتاب نظامی گنجوی کے اس شعر کی تفسیر ہے......

چنیں زد مثل شاہ گویندگاں
کہ پابند گانند جو یندگاں

ترجمہ:

"مطلب یہ کہ جو تلاش کرو گے......تو مقصد پالو گے"

اور یہی اس کتاب کا مقصد ہے اور اس تصنیف کا لب لباب اور مدعا بھی۔ میاں صاحب نے جا بجا

اپنی اس داستان میں اس کا اظہار بھی کیا ہے اُنہوں نے کتاب سے آغاز میں لکھا ہے:

پر جو نال یقینے ٹردے ونج سجن نوں ملدے

ترجمہ:

''یعنی جو لوگ یقین کے ساتھ سفر پر روانہ ہوتے ہیں وہ اپنے محبوب سے ضرور واصل ہو جاتے ہیں۔''

اسی طرح اُنہوں نے اپنی اس کتاب کے خاتمہ میں صاف صاف کہہ دیا ہے:

ایسے ھکسے مصرعے اندر غرض قِصّے دِی ساری
جو ڈھونڈے سو پاوے بھائی مفت نہیں پر یاری

ترجمہ:

''اسی ایک مصرعے میں اس قصے کا سارا مقصد بیان کر دیا ہے۔ اے میرے بھائی جو تلاش کرتا ہے وہی حاصل کرتا ہے یاری ایسی چیز نہیں ہے کہ جو مفت میں ہاتھ آ جائے...... یہ ہے وہ پورا مقصد و مطلب کہ جس کے لئے میاں صاحب نے یہ طویل ضخیم مثنوی لکھی۔ میاں محمد بخشؒ کی یہ عظیم مثنوی 9130 اشعار پر مشتمل ہے اور اس داستان کی تفصیلات بہت زیادہ وسعت کی حامل ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ایک ایسی داستان ہے جو کہ داستان در داستان ہے۔''

مقصودِ داستان

میاں محمد رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کے مختلف مقامات پر تصنیف کی غرض و غایب بیان کی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ عشق و فراق کی داستان کے لباس میں فقر و تصوف کے اسرار بیان کر رہے ہیں۔ اسی قسم کا دعویٰ ان سے پہلے وارث علیہ الرحمۃ نے اپنی داستان ہیر رانجھا کے متعلق بھی کیا ہے۔ میاں محمد فرماتے ہیں:

ھر بیتے وچ رمز فقر دی جے تدھ سمجھ اندر دی
گل سُنا محمد بخشا! عاشق تے دلبر دی

ترجمہ:

''میرے ہر بیت میں فقر کی رمز ہے اگر تجھے باطن کی سمجھ ہے۔ (تو میری پوشیدہ رمز کو سمجھ لو گے) تو اے محمد بخشؒ! اب تو عاشق اور محبوب کی بات بھی سُنا دو۔ (باقی باتیں چھوڑ دے)''

صاحب قصے کا مقصد اپنی زبان سے بتاتے ہیں:

جنھاں طلب قصے دی ہوسی سُن قصہ خوش ہو سَن

جنھاں جاگ عشق دی سینے جاگ سویرے رو سَن

یعنی عوام اس سے کہانی کی لذت حاصل کریں گے اور خواص کی آنکھیں کھل جائیں گی اور ان کے اندر مستقل گداز ورقّت کی کیفیت پیدا ہو جائے گی......

میاں محمد بخشؒ کی سفر العشق کو جو شہرت و نا موری اور جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ اور کسی کو نصیب نہ ہو سکی اور اس مقبولیت و محبوبیت کی وجہ میاں محمد بخشؒ کا کمال فن ہے۔

میاں محمد بخشؒ نے کہنے کو اگر چہ ایک عشقیہ مثنوی تخلیق کی ہے لیکن اس کے پسِ منظر میں ان کا ایک بڑا مقصد پوشیدہ ہے، جس کے بارے میں وہ خود کہتے ہیں:

رمزاں نال پروتا سارا چاہیں سمجھن ہارے

ہمت اگے مشکل آسان ہمت مرد نہ ہارے

ترجمہ:

''یہ سارے کا سارا قصہ اسرار و رموز میں پرویا ہوا ہے صرف سمجھنے والوں کی ضرورت ہے۔
لب لباب یہ ہے کہ ہمت کے آگے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے، انسان کو ہمت سے کام لینا چاہئے، ہمت ہارنی نہیں چاہئے......''

مطلب یہ کہ میاں صاحب نے یہ سارا قصہ سیف الملوک مجازی رنگ میں رنگا ہوا ہے اور عشق حقیقی کے رازوں سے بھر پور ہے۔ اُنہوں نے مجاز کے پردے میں حقیقت کی بات بیان کی ہے۔ جس طرح کہ وہ کہتے ہیں:

دوروں آیا یار ملے گا جاں ہو بھئیں اکّلا

رمز حقیقی کھے محمدؐ! پا مجازی پلا

ترجمہ:

''دور سے آنے والا دوست تجھے اس وقت ملے گا جب تو سب سے الگ تھلگ ہو جائے گا۔ محمد حقیقی رمز مجازی پردے میں کہہ رہا ہے۔''

کاھنوں باطن اندر وڑیوں ظاہر دِی چھڈ بازی

رمز حقانی دِسدا چلیں پردہ پا مجازی

ترجمہ:

''تم کس لئے باطن کی تلاش کر رہے ہو، ظاہر کی بازی بھی چھوڑ دو۔ تم رمز حقیقی پر مجازی پردہ ڈال کر بات بتا دو......''

میاں محمد صاحب نے اپنے اس قصے کو تمثیلی رنگ دے دیا ہے۔ بالکل اسی طرح کہ جس طرح وارث شاہ نے اپنا قصہ ہیر لکھنے کے بعد آخر پر اسے تمثیلی رنگ دیا تھا۔ یعنی ہیر کو روح اور رانجھے کو کلبوت (جسم) قرار دیا ہے۔ اسی طرح میاں صاحب نے بھی اپنے قصہ سیف الملوک کے آخر میں شہزادہ سیف الملوک کی روح جو کہ اپنے کل سے بچھڑ کر اس سے پر ملنے کے لئے سخت بے تاب و بے قرار ہے۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بے شمار مشکلوں اور مصیبتوں سے گزر کر دل تک رسائی حاصل کرنا ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس دل کو ایک نہایت ظالم دیو نفس نے اپنی قید میں لے رکھا ہے۔ جس نے اسے دنیاوی حرص و ہوس کے قید خانے میں ڈالا ہوا ہے۔ اس قید خانے کے دروازے پر بدبختی کا قفل لگا دیا گیا ہے اور اس کے باہر ہوا حرص کے دو شیر پہرہ دے رہے ہیں۔ نفس نے دل پر نیند کا غلبہ حاصل کر رکھا ہے اور ظاہری و باطنی حواس کے پرندے پنجروں میں پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ دیو نفس بڑا طاقتور اور بڑا ہیبت ناک ہے لیکن اس کی جان ایک بڑے کمزور کبوتر کے جسم میں ہے جو غفلت کے دریا کی تہہ میں رکھا گیا ہے۔ اس تک رسائی حاصل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن وہ پہنچ سکتا ہے جس کے پاس مرشد کامل کے دیئے ہوئے شاہ مہرے موجود ہوں۔ ان کو ندی کے سامنے لایا جائے تو وہ صندوق خود بخود اچھل کر سطح پر آ جائے گا اور کبوتر کی گردن مروڑ کر دیو کو ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ میاں صاح ان اشعار میں یہی بتا رہے ہیں:

روح شہزادہ شاہ مہرے نیں صدق محبت بھائی
حرص ہوا دنی دی بنگلہ تن نوں جگہ بنائی

ترجمہ:

''روح شہزادہ اور شاہ مہرے صدق اور محبت ہیں' دنیا کی حرص و ہوا بنگلہ ہے جس کا قیام تن میں ہے۔''

آز حرص دو شیر کلا دے قفل درآں بدبختی
ملکہ خاتون ایہہ دل سُتّا شہوت جادو تختی!

ترجمہ:

''آز اور حرص دو بڑے شیر ہیں۔ دروازوں پر قفل بدبختی کا ہے۔ ملکہ خاتون انسان کا سویا ہوا دل ہے۔ جادو کی تختی شہوت ہے۔''

نفس اساڈا دیو مریلہ' غفلت ندی ڈوھنگھیری!
جھل صندوق ہوئے در پکے کنجی اسم چنگیری!

ترجمہ:

''ہمارا نفس ظالم دیو ہے' غفلت گہری ندی ہے۔ پکے صندوق جہالت ہے' اس کی کنجی اسم اعظم ہے۔''

پنکھی پنجریاں وچ حساں پنج باطن پنج ظاہر
باغ ارم دل تاھنگاں کردے نکلن ہوئے نہ باہر

ترجمہ:

"پنجروں میں بند پنکھی پانچ ظاہری اور پانچ باطنی حواس ہیں جو باغ ارم کی طرف پرواز کرنا چاہتے ہیں، لیکن باہر نہیں نکل سکتے......"

بابل مرشد جس شاہ مہرے تحفہ چیز سجائی
اس دے دتے نے شاہ مہرے ہمت کریں کمائی

ترجمہ:

"بابل مرشد ہے جس نے حیرت انگیز تحفہ شاہ مہرے دیئے ہیں جن کی مدد سے انسان عزم و ہمت کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے۔"

روح شہزادہ ندی پرم دی بیڑا جان بدن نوں
جانی نال ملیں تد جانی کریں شکستہ تن نوں

ترجمہ:

"پریم کی ندی میں شہزادہ سیف الملوک روح ہے اور بدن ایک کشتی ہے، تو محبوب سے اس وقت ملے گا جب اپنے آپ کو ختم کر دے گا۔"

یہی نہیں بلکہ وہ اپنے قارئین کو بھی اسی حقیقت کی تلاش کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

قصہ سارا اے اشارہ جے کوئی سمجھن ہارا
کاہنوں ظاہر کریں محمد گجھا بھید نیارا

ترجمہ:

"اگر کوئی سمجھنے والا ہو تو یہ سارا مجازی قصہ حقیقت کی طرف اشارے کر رہا ہے......اے محمد تو یہ چھپا ہوا بھید کیوں ظاہر کر رہا ہے......"

اسی طرح جب وہ اپنی اس طویل داستان کے اختتام تک پہنچتے ہیں تو ایک دفعہ پھر پڑھنے والے کو اس حقیقت کا احساس دلاتے ہیں جو انہون نے داستان کے مجازی پردے میں چھپائی ہے۔

پریاں چار مراد کتاباں کیوں بھلاوا پاواں
نہیں تاں حکم میرا کد اتنا پریاں سد بھاواں
تھوڑی بات کتاباں اندر بھتی آپ بنائی
کیکر آپ بناوے عاجز سبھو دات خدائی

ترجمہ:

''میں آپ کو بتاتا چلوں کہ پریوں سے چار کتابیں مراد ہے اگر یہ نہ ہوتا تو بھلا میری کیا مجال تھی کہ حکم دے کر پریوں کو بلا لیتا۔

کتابوں میں کم قصہ تھا' لیکن میں نے اسے زیب داستان سے بڑھالیا ہے میں بھی کیا بڑھا سکتا تھا' یہ تو سب خدا کی دین ہے۔''

بنیادی علامات کی اس توضیح سے سیف الملوک کے قصے کا اصل مقصد بالکل واضح ہو جاتا ہے' نفس مطمئنہ اور وصل باللہ کے تمام رموز و معارف ان علامات میں سموئے گئے ہیں۔

میاں محمد بخشؒ کی یہ بات کہ انہوں نے اس داستان میں مجاز کے پردے میں حقیقت کہی ہے ماننے کے قابل ہے' مگر یہ حقیقت تصوف کا کوئی روپ نہیں ہے۔ گو وہ زندگی میں ہمہ اوست کے قائل نظر آتے ہیں' لیکن انہوں نے اپنی اس سیدھی سادی عشقیہ داستان میں تصوف کی گتھیاں کو نہیں سلجھایا' یوں بھی ہوا ہے کہ بعض جگہ وہ ایسے اشعار کہہ جاتے ہیں جو واضح طور پر تصوف کا کوئی پہلو لئے ہوئے ہیں لیکن کتاب کا مطالعہ کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ میاں محمد بخشؒ مجاز کے پردے میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں' وہ ان کی اپنی زندگی ہے۔

قصہ مختصر' میاں صاحب نے ہمیں اپنے قصہ سیف الملوک میں تمثیلی انداز میں' سفر العشق کے روپ میں عمل کا درس دیا ہے۔ یعنی اُنہوں نے عشق کے راستے جدوجہد اور عمل کا درس دیا ہے۔ جدوجہد اور سعیٔ پیہم میاں صاحب کے تصور عشق کی اصل بنیاد ہے......

جنہاں عشق خرید نہ کیتا ایویں آ بگتے
عشقے باجھ محمد بخشؒ کیا آدم کیا کُتّے

ترجمہ:

''جس نے عشق کو قبول نہ کیا وہ یونہی خراب و برباد ہوتا رہا۔ اے محمد بخشؒ! عشق کے بغیر انسان اور کُتے میں کچھ فرق نہیں ہے' دونوں برابر ہیں۔''

میاں محمد بخشؒ عشق و محبت کو شرفِ انسانی کا باعث سمجھتے ہیں' عشق کو انسانیت کا لازمہ قرار دیتے ہیں' کہتے ہیں کہ جو شخص اس سے ناآشنا ہے وہ کتوں سے بھی بدتر ہے۔

جس دل اندر عشق نہ رچیا کُتّے اس تھیں چنگے
خاوند دے در راکھی کر دے صابر بھکّے ننگے

ترجمہ:

''جس دل کے اندر عشق نہ سمایا' اس سے تو کتے ہی اچھے ہیں جو اپنے مالک و آقا کے

دروازے کی رکھوالی کا کام بڑی ذمہ داری کے ساتھ سرانجام دیتے ہیں اور بھوکے ننگے رہ کر بھی انتہائی صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔
زہد و عبادت عشق کے بغیر بے ثمر ہے' جویائے حق کے لئے آتش عشق میں جلنا ضروری ہے جو شخص دردِ عشق سے بے بہرہ ہے وہ سلوک کی منزلیں طے نہیں کر سکتا۔ عشق وہ روگ ہے جو چارہ گری کا محتاج نہیں ہے۔"

آخر تیک نہ چھٹن جوگا جو پھاتا اس پھاھی

ڈھاڈو عشق محمد بخشا لئے پاندھی راھی

ترجمہ:

"جو شخص ایک بار عشق کے جال میں پھنس جائے وہ کبھی بھی رہائی نہیں پا سکتا' عشق قزاق ہے جو راہ چلتوں کو لوٹ لیتا ہے......"

قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال

میاں محمد بخشؒ نے اپنے وقت کے پنجابی شاعروں کی مثنویوں' کتابوں اور قصہ کہانیوں کی طرح اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے۔ سب سے پہلے اپنی عاجزی کا اظہار' پھر حمد باری تعالیٰ اس کے بعد نعت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)' پھر معراج شریف کا ذکر اور حضور غوث شاہ جیلاں کی مدح اپنے دادا پیر کی منقبت' اس کے بعد اپنے مرشد کی مدح میں شعر لکھے ہیں اور اپنے مرشد کے سجادہ نشین کی مدح بھی کی ہے۔ ''اور باعث تصنیف کتاب مے گوید'' بھی تحریر کی ہے اور پھر اصل قصے کو بیان کرتے ہیں کہ مصر کا ایک شہزادہ ''سیف الملوک'' شارستان کے حکمران شاہپال کی بیٹی پری بدیع الجمال کے حسن و جمال پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا۔ اور اپنا تاج و تخت چھوڑ چھاڑ کر اس کے عشق میں شارستان کی طرف چل دیا۔ وہ سفر کی مشکلات سے دوچار ہوتا اور راستے کی صعوبتوں کو برداشت کرتا ہوا آخرکار پری بدیع الجمال سے جا ملا۔ اس سے شادی کی اور اپنے ملک میں ساتھ لیجا کر حکومت کرنے لگا اس طرح میاں محمد بخشؒ نے قصے کی بنیاد رکھ کر شہزادہ سیف الملوک اور پری بدیع الجمال کی عشقیہ داستان بیان کی ہے اور اس داستان گوئی میں اپنا زور قلم صرف کر دیا ہے اور حسن بیان فنکاری اور داستان گوئی کو ایک مثالی رنگ دیا ہے۔ بظاہر یہ ایک داستان اور عشقیہ کہانی ہے لیکن اس میں عشق مجازی کو عشق حقیقی کے رنگ میں پیش کیا ہے اور تصوف کی بے شمار گتھیاں سلجھائی ہیں' جسم اور روح کے اتصال کو شہزادہ اور پری سے تشبیہ دی ہے۔ جسم روحانیت کے مدارج طے کرنے کے لئے کس طرح اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈالتا ہے۔ شہزادے کو خواب اور تصور میں پری سے عشق دراصل انوار الٰہی کی ایک جھلک تھی جس کے حصول کے لئے اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور راستے کی مشکلات اس مقام کو حاصل کرنے کے لئے سلوک کی مختلف منازل تھیں جو اس نے پوری جوانمردی اور خندہ پیشانی سے طے کیں اور آخرکار مقصود حقیقی کو پا لیا۔ راستے کی مشکلات میں مختلف مقامات پر لوگوں کی رہنمائی' پیر اور مرید کی جدوجہد کی عملی تصویر ہے جسے متعدد رنگوں میں پیش کیا ہے۔ جنات کے خلاف جنگ کو نفس امارہ کے خلاف محاذ آرائی کا نمونہ پیش کیا ہے کہ کس طرح انسان ارواح خبیثہ سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے پھر اس راہ میں انسانی ہمدردی' غمخواری

اور نفس کشی کے طریقے بتلائے ہیں اور کردار و عمدہ اخلاق کا شاندار مظاہرہ کیا ہے تا کہ تزکیۂ نفس کے بعد اعلیٰ مدارج بخوبی طے کر سکے۔

مختلف طوفانی مناظر کے ذریعہ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ پیش کیا ہے اور اس دنیا میں ہر قسم کی جاذبیت اور رنگینی کو حرف غلط کی طرح مٹ جانے کی حقیقت بیان کی ہے اور ان لوگوں کو تنبیہہ کی ہے جو اُس دنیا ناپائیدار میں دل لگا کر خالق و مالک کو فراموش کرنے کے علاوہ اپنی ہستی کو بھی بھول جاتے ہیں اور طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے دنیا کو حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

اس قصے میں ان لوگوں کی گوشمالی بھی کی ہے جو مظلوموں، بے کسوں اور ناداروں کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں ایک کھلونا سمجھ کر توڑنے کے درپے ہوتے ہیں۔

سمندروں کی گہرائی اور حد نظر سے بھی زیادہ وسعت کو دل کی گہرائی سے تشبیہہ دی ہے کہ تصوف کے سلوک و منازل طے کرنے کے لئے وسیع النظری اور وسعت قلبی شرط اول ہے۔ آخر میں سیف الملوک اور پری بدیع الجمال کی موت کا ذکر کر کے دنیا کی بے ثباتی اور انسان کا انجام بتایا ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ رہنے کی جگہ نہیں ہے کوئی آج گیا تو کوئی کل چلا جائے گا اس لئے اس دنیا میں دل لگانا کیا......

اس مختصری تمہید کے بعد چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ جن سے اس "قصے کی ادبی حیثیت" پر کچھ روشنی پڑ سکے گی۔ تصوف کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

عشق کے بعد دوسرا درجہ آپ نے علم کو دیا ہے، آپ نے علم کو روح کا نور کہا ہے اور بے علم انسان کو حیوان سے تشبیہہ دی ہے۔

جیویں سورج وچ نور تیویں ھے عشق روح وچ جانے
نورے باھجوں سورج پتھر، آدم جنس حیوانے

ترجمہ:

"عشق روح میں اس طرح ہوتا ہے جس طرح سورج میں نور، نور کے بغیر سورج پتھر ہے اور آدمی علم کے بغیر حیوان! عشق اور علم کی حقیقت سے آگاہ کرنے کے بعد میاں محمد صاحب انسان کو عمل کی طرف راغب کرتے ہیں اور مقصدِ حیات تک پہنچنے کے لئے حوادث سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ سیف الملوک کا کردار بہت بلند ہمت کردار ہے اور تمام قصے میں اس کی حیثیت ایک باوقار اور بلند حوصلہ انسان کی ہے جو قدم قدم پر مصائب کا مقابلہ کرتا ہے اور کسی مقام پر بھی اُس کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آتی۔ کم ہمتی اور

بزدلی کو میاں محمد صاحب نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ آپ کے نزدیک زندگی
جدوجہد کا نام ہے اور آپ کے پیغام میں ایک عظمت پائی جاتی ہے جس سے
شکست خوردہ انسانوں کے دلوں میں عمل اور یقین کی شمعیں روشن ہوتی ہیں۔''
''دنیا کی بے ثباتی'' کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے......

مان نہ کریئے روپ گھنے دا وارث کون حسن دا
سدا نہ رہسن شاخاں ہریاں سدا نہ پھل چمن دا
سدا نہ لاٹ چراغاں والی سدا نہ سوز پتنگاں
سدا نہ ڈاراں نال قطاراں رہسن کد کلنگاں
سدا نہیں ہتھ مہندی رتے سدا نہ چھنکن ونگاں
سدا نہ چھوپے پا محمد رل مل بہنا سنگاں

ترجمہ:

''خوب صورت گھنیرے روپ کا فخر نہ کر' حسن کسی کی جاگیر نہیں' یہ سرسبز شاخیں
ہمیشہ نہیں رہیں گی نہ چمن کا پھول ہی ہمیشہ رہے گا۔ نہ ہمیشہ چراغوں کی روشنی رہے گی
نہ ہمیشہ پروانے جلیں گے اور نہ ہمیشہ کلنگ قطار اندر قطار اڑیں گے' نہ ہمیشہ ہاتھوں
میں حنا کی سرخی رہے گی۔ نہ ہمیشہ چوڑیاں کھنکیں گی' نہ ہمیشہ ہم جولیاں ترنجن میں
بیٹھ کر سُوت نہیں کاتیں گی اور نہ ہمیشہ یار دوست باہم مل کر بیٹھیں گے۔''

دنیا دارالفنا ہے جو کل تھا وہ آج نہیں جو آج ہے وہ کل نہ ہوگا۔ اس لئے میاں محمد صاحب انسان کو وقتی
مسرتوں اور فضول مشاغل میں وقت ضائع کرنے سے منع کرتے ہیں' اور ابدی سکون حاصل کرنے کیلئے
نیک اعمال کرنے کی تلقین فرماتے ہیں' کیونکہ مرنے کے بعد صرف نیک اعمال ہی کام آسکتے ہیں اور
میاں محمد صاحب نے کتنے موثر اور محبت بھرے انداز میں اس کا احساس دلایا ہے۔

لوئے لوئے بھرلے کڑیئے جے تدھ بھانڈا بھرنا
شام پئی بن شام محمدؔ گھر جاندی نے ڈرنا

ترجمہ:

''دن کی روشنی میں تو اپنا برتن بھر لے ورنہ جب شام ہو جائے گی تو تو شام (یعنی محبوب) کے
بغیر گھر جاتے ہوئے ڈرے گی۔''

یہ شعر درسِ عمل کے لئے اتنا مکمل اور جامع ہے کہ اس کے بعد کسی مثال کی گنجائش نہیں رہتی۔ میاں محمد
صاحب اس شعر میں ایک ایسی لڑکی کو مخاطب کر رہے ہیں جو گھڑا لئے ندی کے کنارے کھڑی ہے (ندی

سے مراد دنیا ہے) اور اسے کہتے ہیں کہ تو اپنا گھڑا سویرے سویرے بھر لے۔ یعنی زندگی میں نیک اعمال کر لے ورنہ جب شام ہو گی یعنی تو مر جائے گی تو اپنے ''شام'' یعنی محبوب کے بغیر (محبوب سے مراد نیک اعمال ہیں) اپنے گھر یعنی قبر میں جاتے ہوئے ڈرے گی۔

قصہ سیف الملوک میں اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ملتی ہیں......جن سے میاں محمد صاحب کے پیغام کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

اب قصے کے ''رومانی حصے'' کو لیجئے۔ رومانی شاعری میں بھی میاں محمد صاحب کا رتبہ بہت بلند ہے اس حصے میں ہمیں انوکھے خیالات اور ایسی نادر تشبیہیں ملتی ہیں جنہیں ہم بلاشبہ اردو ادب کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ میاں محمد صاحب نے ملکہ خاتون کے حسن کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے......

ترجمہ:

''پیشانی سورج کی طرح روشن ہے جس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا جاتا اور اگر پتھر دل والا دیکھے تو بھی آنکھوں میں پانی آ جائے۔''

جادوگر دو نین کڑی دے وچ کجلے دی وھاری
صوفی ویکھ هوون مستانے چھڈن شب بیداری

ترجمہ:

''لڑکی کی دونوں آنکھیں جادوگر ہیں اور ان میں کاجل کی دہاری ہے جس کو دیکھ کر صوفی بھی مست ہو جائیں اور شب بیداری چھوڑ دیں۔''

ٹھوڈی وانگ خوبانی سوھنی٬ بھی رس بھری سی
پتلا اُچا قد رنگیلا٬ نازك شاخ هری سی

ترجمہ:

''تھوڑی سرخ خوبانی اور رس بھری بہی کی طرح ہے، پتلا جسم اور اونچا قد اس طرح ہے جیسے ہری بھری نازک شاخ......''

سیف الملوک، بدیع الجمال کے فراق میں عام عاشقوں کی طرح آہ و بکا نہیں کرتا۔ بلکہ اس کی فریاد میں بھی ایک وقار پایا جاتا ہے اور وہ اپنے محبوب کو اس کے تغافل کا احساس ایسے الفاظ میں دلاتا ہے جس میں اُس کی خودداری پر الزام نہیں آتا۔

حسن جمال تیرا کس کاری عاشق سکدا مرسی
جاں دیدے نابینے هوئے پھر سرمه کے کرسی

ترجمہ:

''تیرا حسن و جمال کس کام آئے گا' جب عاشق حسرت ہی حسرت میں مر جائے گا۔ جب آنکھوں کا نور چھن جائے تو سرمہ کچھ اثر نہیں کر سکتا۔''

جاں کھیتی واکھ نہ رہیا نہ سکا نہ ہریا
کس کم دھپ سکاون والی' کس کم بدل ورھیا

ترجمہ:

''جب کھیتی اس طرح اُجڑ جائے کہ اس میں ہرا یا خشک ایک تنکا بھی نہ رہے تو پھر وہ دھوپ جس سے فصل پکتی ہے کس کام کی ہے اور بادل برسے تو کیا فائدہ ہوا!''

نیچ ذات کے لوگ بے وفا ہوتے ہیں' اور ان سے دوستی کرنا خود کو تباہ کرنا ہے۔ میاں محمد صاحب اس حقیقت کے اظہار کے لئے ایسی مثال پیش کرتے ہیں جس کا جواب تلاش کرنے سے بھی نہیں مل سکتا......

نیچاں دی اشنائی وچوں کسے نہیں پھل پایا
کِکّر تے انگور چڑھایا ہر گُچھا زخمایا

ترجمہ:

'': نیچ کی دوستی سے کوئی پھل نہیں پاتا' جس طرح کیکر کے درخت پر انگور کی بیل چڑھائی جائے تو خوشے زخمی ہو جاتے ہیں۔''

مگر سیف الملوک ایک ذی شعور انسان ہے وہ ایک ہی دلیل سے' ذات پات کی تمام تفاوتوں کو غلط ثابت کر دیتا ہے۔

اک کالے اک سبز کبوتر اک چٹے بن آئے
کالے چٹے ملن محبت نہ بن بہن پرائے
حسن محبت سب ذاتاں تھیں اچی ذات نیاری
نہ ایہ آبی' نہ اے بادی نہ خاکی نہ ناری

ترجمہ:

''کبوتر کالے سبز اور سفید رنگ کے ہوتے ہیں' مگر کالے اور سفید آپس میں ملتے ہیں اور پرائے نہیں بنتے۔ حسن اور محبت کی ذات سب ذاتوں سے بلند ہے اور یہ نہ آبی ہے نہ بادی نہ خاکی نہ ناری۔ عشق حقیقی انسان کو ذات پات' رنگ و نسل سے بھی بلند کر دیتا ہے۔ اس میں اخوت و مساوات کا ہمہ گیر پیغام ہے۔''

کچھ اور زندگی کے حقائق دیکھئے......

هسن کھیڈن نال لے گیوں سٹ گیئوں وچہ فکراں
پاٹی لیر پرانی وانگوں ٹنگ گئیوں وچہ ککراں

ترجمہ :

''ہنسنا کھیلنا تو اپنے ساتھ لے گیا اور ہم پریشانیوں میں یوں گھرے ہوئے ہیں جیسے کوئی پرانے پھٹے کپڑے کیکروں کے اوپر ڈال جائے......

بس مرا کجھ وَس نہ چلدا کی تساڈا کھوناں
لِسے دا کی زور محمد نَس جاناں یا روناں

ترجمہ :

''میرا کوئی زور نہیں چلتا۔ میں تمہارا کیا بگاڑ سکتا ہوں' کمزور کا کیا زور' وہ سوائے بھاگنے اور آہ و زاری کے کیا کر سکتا ہے......''

دنبہ جاں بگھیاڑاں کھاھدا آجڑیاں کی کرناں
کانگے نہیں گھراں دی پٹی کس اُتے چھت دھرناں

ترجمہ :

''جب بھیڑیوں نے بکرے کو کھالیا' تو پھر چرواہے کیا کریں گے' جب سیلاب نے گھروں کی بنیاد ہی اُکھیڑ دی' تو پھر چھت کاہے پر ڈالی جائے گی......''

ٹنڈاں بھر بھر پانی ڈوھلن وانگن دکھیا نیناں
مڑ جاون جیوں ٹور بھراواں گھر وَل جاون بھیناں

ترجمہ :

''ٹنڈیں دکھی نینوں کی طرح پانی بہا رہی تھیں اور یوں مڑتی تھیں جیسے بھائیوں کو الوداع کہہ کر بہنیں گھر مڑتی ہیں......''

کھوہ وچہ پانی بولے رووے جیوں پت وچھڑے بابل
پانی ہر کیارے پھردا جیوں ہر بوھے راول

ترجمہ :

''کنوئیں میں پانی کی آواز سُنائی دیتی' جیسے بیٹوں سے بچھڑا باپ رو رہا ہو۔ پانی ہر کیاری تک یوں پہنچ رہا تھا۔ جیسے راول ہر دروازے پر جاتا ہے۔''

سدا نہ رست بازاراں وکسی سدا نہ رونق شہراں
سدا نہ موج جوانی والی سدا نہ ندیئیں لہراں

سدا نہ تابش سورج والی جیوں کر وقت دوپہراں
بے وفائی رسم محمد سدا ایہو وچ دھراں اں
حسن مہمان نہیں گھر باری کی اس دا بھر مانناں
راتیں لتھا آن ستھوے فجری کوچ بولاناں
سنگ دے ساتھی لدی جاندے اساں بھی ساتھ لداناں
ھتھ نہ آوے فیر محمدؐ جاں ایہہ وقت وہاناں
سدا نہیں مرغابیاں بہناں سدا نہیں سر پانی
سدا نہ سیّاں سیس گنداون سدا نہ سرخی لانی
لکھ ھزار بہار حُسن دی خاکو وچہ سمانی
لا پریت محمد جس تھیں جگ وچہ رھے کہانی

ترجمہ:

''ہمیشہ بازاروں میں کھانے پینے کی چیزیں نہیں بکیں گی۔ سدا بازاروں میں رونق نہیں رہے گی۔ ہمیشہ جوانی کا جوش اور ولولہ نہیں ہوگا۔ سدا ندیوں میں لہریں نہیں اٹھیں گی۔ سورج کی حدت ہمیشہ دوپہر جیسی نہیں ہوگی۔ اے محمد بے وفائی زمانے کی ہمیشہ ریت رہی ہے۔ حسن چند دن کا مہمان ہے۔ پھر اس پر ناز کیا! یہ ایسا مسافر ہے' جو رات کو آیا' صبح روانہ ہو گیا۔

ہمارے ہم عمر ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں...... ہمیں بھی کوچ کرنا ہے۔
اے محمد! جب یہ وقت بیت گیا تو ہاتھ نہیں آئے گا۔

سدا مرغابیاں پانی میں نہیں تیریں گی۔ ہمیشہ تالابوں میں پانی نہیں ہوگا۔ عورتیں ہمیشہ گیسو نہیں سنواریں گی۔ نہ ہونٹوں پر سُرخی لگائیں گی۔

حسن کے لاکھوں جلوے خاک میں مل کر خاک ہو جائیں گے' اے محمد' ایسی پریت لگا۔ جس سے تمہاری کہانی دنیا میں ہمیشہ باقی رہے۔

مقصدیت اور لطیف احساس جمال جو ہر نے سیف الملوک کو لوک داستان کا درجہ دے دیا ہے اور اسے آگہی و بصرت کا آئینہ بنا دیا ہے۔''

میاں محمد بخشؒ کے ہاں عشق الٰہی اور تصوف نے ایک تخلیقی سرگرمی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ان کا انداز بیان خشک اور واعظانہ نہیں ہے بلکہ اس میں مجازی حقائق سے زیادہ حلاوت دکھائی دیتی ہے۔ ذاتی طور پر صوفیانہ تجربات و مراحل سے گزرتے ہوئے ان کے ہاں تصوف کے بہت سے نازک اور مشکل مسائل

روایتی طور پر نہیں بلکہ ایک سچے تجربے کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔

ریت وجود تیرے وچہ سونا اینویں نظر نہ آوے
ھنجواں دا گھت پانی دھوویں ریت مٹی رُھڑ جاوے
پارہ گھت محبت والا گولی ھك بناوے
خاك رلے وچہ خاك محمك سونا قیمت پاوے
دُدھ وجود تیرے وچہ شیریں روغن دار سمانی
مرشد لاوے جاگ پرم دی تاں جمیں دُودھ پانی
گل وچہ پھاہ غماں دا گھت کے ذکروں چھك سدھانی
ھمت نال محمد بخشا مکھن آیا جانی

ترجمہ:

''تیرے ریت جیسے وجود میں سونا پوشیدہ ہے' جو بظاہر دکھائی نہیں دیتا لیکن جب تو اسے آنسوؤں کے پانی سے دھوئے گا تو ریت اور مٹی بہہ جائے گی اور سونا باقی رہ جائے گا۔
محبت کا پارہ مٹی میں ڈال' ایک شخص گولی بناتا ہے۔ مٹی' مٹی سے مل کر سونے کی قیمت پاتی ہے۔
تیرے دُودھ وجودھ میں شیریں روغن دار ''چاٹی'' (دودھ بلونے کا برتن) ہے۔ جب مرشد اس میں محبت اور پیار کی ''جاگ'' لگاتا ہے۔ تب دودھ اور پانی جم جاتے ہیں۔
اپنے گلے میں غموں کی رسی ڈال کر تو ذکر کی ''مدھانی'' کھینچ۔ ہمت کے ساتھ یہ عمل کر۔ یقیناً اس سے مکھن حاصل ہوگا۔ (یعنی تو اپنی مُراد کو حاصل کرلے گا۔''

روایتی طور پر نہیں بلکہ ایک سچے تجربے کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔

ریت وجود تیرے وچہ سونا اینویں نظر نہ آوے
ھنجواں دا گھت پانی دھوویں ریت مٹی رُھڑ جاوے
پارہ گھت محبت والا گولی ھك بناوے
خاك رلے وچہ خاك محمد سونا قیمت پاوے
دُدھ وجود تیرے وچہ شیریں روغن دار سمانی
مرشد لاوے جاگ پرم دی تاں جمیں دُودھ پانی
گل وچہ پھاہ غماں دا گھت کے ذکروں چھك سدھانی
ھمت نال محمد بخشا مکھن آیا جانی

ترجمہ:

" تیرے ریت جیسے وجود میں سونا پوشیدہ ہے، جو بظاہر دکھائی نہیں دیتا لیکن جب تو اسے آنسوؤں کے پانی سے دھوئے گا تو ریت اور مٹی بہہ جائے گی اور سونا باقی رہ جائے گا۔
محبت کا پارہ مٹی میں ڈال، ایک شخص گولی بناتا ہے۔ مٹی، مٹی سے مل کر سونے کی قیمت پاتی ہے۔
تیرے دُودھ وجودھ میں شیریں روغن دار " چاٹی " (دودھ بلونے کا برتن) ہے۔ جب مرشد اس میں محبت اور پیار کی " جاگ " لگاتا ہے۔ تب دودھ اور پانی جم جاتے ہیں۔
اپنے گلے میں غموں کی رسی ڈال کر تو ذکر کی " مدھانی " کھینچ۔ ہمت کے ساتھ یہ عمل کر۔ یقیناً اس سے مکھن حاصل ہوگا۔ (یعنی تو اپنی مُراد کو حاصل کر لے گا۔"

انسانی دُکھ کا احساس اور دنیا کی بے ثباتی

میاں محمد بخشؒ نے ان عقیدت مندوں کو جو دور دراز علاقوں سے دکھ درد بیان کرنے اور سکون کی تلاش میں آتے تھے' ان کے غم کا مداوا بھی کیا' لیکن زیادہ تر انہیں روحانیت کا درس دے کر ان کے دلوں کو سکون کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔' تاہم میاں صاحب نے اپنی اس کتاب کی تصنیف میں عقل و دانش کے تمام دروازے کھول دیئے ہیں۔ اور جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ اپنے علم اور سوچ کا ہر جادو آزمایا ہے۔

انسانی دکھوں اور زندگی کے غموں کا احساس ان کے دل میں چھایا رہتا ہے' یہی احساس ان کی اس کتاب میں جگہ جگہ قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دنیـــا اُتّـــے کـــون امـــن وچ هـــر کـــوئـــی دُکھیـــارا
بـــے وفـــا ســـنســـار همیشـــه ٹهگ بـــازاری بهـــارا

☆

مـــاتـم ســوگ غـمـی جگ ســارے ویکھو کون سُکھـالا
جے کـوئـی ســدا سـکھـالا دِسـدا سو بھی هے دُکھ والا

☆

جُھلّـن رکـــھ هـوائیں کـنـوں کھیڈن حـال غمـاں دے
بـــولـــن خـــوش آواز جـــنـــاور پھـولـن درد دلاں دے
خـمـرے کـوئـل کـوکـو کـــر دے کیسی کوك سُنـانـدے
کتّھے سُـکــھ مـحـمـدٌ بـخشـا بھـرے جهـان دِکھـانـدے

ترجمہ:

''دنیا میں کسے سکون و امن حاصل ہے؟ ہر کوئی یہاں دکھی ہے' یہ دنیا سب سے بڑی ٹھگ ہے' اس نے کسی سے وفا نہیں کی۔

سارے جگ میں ماتم، غم اور سوگ کے سوا کچھ بھی نہیں، یہاں کوئی بھی سکھی نہیں ہے۔
جو یہاں ہمیشہ سکھی دکھائی دیتا ہے اس کے دل میں بھی کوئی نہ کوئی دکھ ہوتا ہے،
یہ جو خوش آواز پرندے چہچہاتے ہیں یہ اپنے دلوں کے دکھ درد بیان کرتے ہیں
یہ کوئلیں اور یہ قمرے جو کوکو کرتے پھر رہے ہیں، ان کی کوک کیسی ہے؟
اے محمد بخشؒ! یہاں سکھ کہاں، یہ دنیا تو ساری دکھوں سے بھری پڑی ہے۔''
اس حقیقت کو میاں محمد بخشؒ اپنے شعروں میں بیان کرتے ہیں:

ایہہ پُل پور لنگھاون ھارا' جو آیا اُس تُرنا
کون مقامی ھر دے سِر تے کوچ نقارہ کُھرنا
دنیا باغ پرانا بھائی' نویں نویں پُھل بنّدے
پُھلّن ساتھ چُنیندے بعضے کوئی اک روز دسندے
ھر اک شاخ عمر دی نالوں توڑ کھڑے جدمالی
پتّاں پُھلاں پوے وچھوڑہ رو رو کھندی ڈالی
کئی بھاراں ھو ھو گیاں ڈھٹھے پَت بچارے
کئی ھزار بھور گُلاں دے کر کر گئے نظارے
جاندے کسے نہ نظریں آئے گُل پُھل بَھور ہزاراں
دستاراں سر مٹی ھوئے سکیڑیاں سرداراں
کھاں گئے جمشید فریدوں بھمن ناگ ڈنگالا؟
کیخسرو تے رستم دستان' سام نہ ھویا سمجھالا
کیکائوس سیاوش کتھے کھاں سکندر دارا؟
افلاطون ارسطو کتھے کردے عقل پسارا
دنیا نال نہ گئی کسے دے ٹُر ٹُر گئے اکلّے
اوھو بھلے جنھاں چھنڈ رکھے اس دھوڑوں ھتھ پلّے
جمدڑیاں وچ خاکو سُتّے چکڑ پیر نہ بھریا
اس جوئے جس بازی لائی کس نہیں دھن ھریا؟
دانشمندں دا کم ناھیں دنیا تے دل لانا
اس بَوھٹی لکھ خاوند کیتے جو کیتا سو کھانا
جس چھڈی ایہہ بچے کھانی' سویو سگھڑ سیانا

ایسی ڈائن نال محمدؒ کاھنوں عقد نبھانا
نت نویں ایھہ بن بن بھندی بڈھی مول نہ دِسدی
ھر اک سنگ کریندی گوشے نہیں اگّی پروسدی
ننگیں پیریں گئے بدیسی خاک رلے سب مر کے
کھو کیہ مان محمد بخشؒ آ رھو نمانا ڈر کے

ترجمہ:

''یہ دنیا ایک پل ہے جس پر سے لوگوں کو گزرنا ہے۔ یہاں جو بھی آیا اسے چلے جانا ہے یہاں کوئی مستقل قیام نہیں کرتا سب کے سروں پر کوچ کا نقارہ بجے جا رہا ہے۔ اے بھائی! یہ دنیا ایک پرانا باغ ہے' یہاں نئے نئے لوگ نئے نئے پھولوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ ان پھولوں میں سے بعض کو کھلتے ہی توڑ لیا جاتا ہے اور بعض دو ایک روز تک بہار دیکھ لیتے ہیں۔ تو پھولوں اور پتوں میں جدائی ہو جاتی ہے اور شاخ رو رو کر پکارتی رہ جاتی ہے۔ ہزاروں بھنورے پھولوں کا نظارہ کر کے رخصت ہو گئے۔ یہ ہزاروں بھنورے یہ ہزاروں پھول جب رخصت ہوئے تو پھر کسی کو دکھائی نہ دیئے کہ کس طرف چلے گئے۔ سینکڑوں سرداروں کے شملے والے سر مٹی میں مل گئے۔

وہ جمشید' فریدوں اور زہریلا ناگ (ڈسوانے والا) بہمن کہاں چلا گیا۔ نجر' رستم اور سام جیسے بہادر بھی موت سے نہ بچ سکے۔ وہ سکندر و دارا اور کیکاؤس و سیاش سب کہاں چلے گئے؟ وہ ارسطو اور افلاطون کہاں ہیں جنہوں نے اپنی عقل و دانش سے کیا کیا گل کھلائے؟ دنیا کسی کے ساتھ نہیں گئی وہ جیسے تھی ویسے ہی ہے اور سب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے۔ یہاں وہی لوگ اچھے رہے ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھ اور کپڑے اس کی دھول سے بچائے رکھے۔ بعض پیدا ہوتے ہی مٹی میں جا سوئے اور انہوں نے اپنے پاؤں کیچڑ میں ڈالے ہی نہیں۔ جس کسی نے بھی اس جوئے میں بازی کھیلی ہے ان میں کوئی ایسا نہیں جس نے اپنا پیسہ نہ ہارا ہو...... دنیا میں دل لگانا عقلمندوں کا کام نہیں۔ یہ دنیا تو ایک ایسی دلہن ہے جس نے لاکھوں شوہر کئے اور جس کسی کو بھی اس نے اپنا شوہر بنایا اسے خود ہی ہڑپ کر گئی۔ یہ ہمیشہ نئے سے نیا سنگھار کر کے بن بن کے بیٹھتی ہے اور بالکل بوڑھی نظر نہیں آتی۔ یہ ہر ایک کے ساتھ تنہائی میں عیش کرتی ہے' لیکن کسی ایک کی بن کے نہیں رہتی۔

اے محمد بخشؒ! اس دنیا میں اور اس زندگی پر گھمنڈ اور فخر کیسا' یہاں تو مسکین بن کر رہ اور ہمیشہ ڈرتا رہ۔

تصوف کی آمیزش

میاں محمد بخشؒ ایک درویش اور صوفی شاعر تھے۔ تصوف کے ساتھ ان کا گہرا تعلق تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری کو تصوف کی رمزوں سے سجایا ہے۔ تصوف اصل میں ایک ایسا باطنی علم ہے کہ جس کے ذریعے انسان کی باطنی اصلاح و صفائی ہوتی ہے۔ علم تصوف پر عمل کرنے سے نہ صرف تمام انسانی برائیاں اور دنیاوی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں بلکہ انسانی قلب میں اس سے پاکیزگی بھی آ جاتی ہے اور اس میں وہ تمام صفات پیدا ہو جاتی ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ تصوف کے بارے میں میاں صاحب نے کئی جگہوں پر بڑے گہرے اسرار و رموز بیان کئے ہیں:

اس میدان نہ چلے گھوڑا شینہ حیرت دا گجّے
خاص پہلے لَا اَحصی [1] کہہ کے اس دوڑوں سن رجّے

ترجمہ:

''یہ ایک ایسا میدان ہے جس میں گھوڑا نہیں دوڑایا جا سکتا وہاں تو حیرت کا شیر گرجتا ہے جب سرورِ کائنات نے یہ فرمایا تھا کہ اے اللہ میں تیری ثناء نہیں کر سکتا جیسی کہ وہ ہے تو پھر اور کسی کی کیا مجال ہے کہ اس کی ثناء کر سکے۔''

اس مجلس دا محرم ہو کے فیر نہ مُڑدا کوئی
جو ایہہ مست پیالہ پیندا ہوش کھڑاندا سوئی

ترجمہ:

''جو اس مجلس کا محرم ہو وہ واپس نہیں آتا' جو یہ مست پیالہ پی لیتا ہے' اس کے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔''

جیکر تینوں طلب محمدؐ اس رستے ٹُر آڑیا
مڑ آون دی رکھ نہ ھکھی ایتھوں کوئی نہ مُڑیا

[1] حدیث شریف

تصوف ایک دریا ہے اور مرشد کامل ایک ملاح ہے جس کے بغیر کشتی میں بیٹھ کر اس دریا سے پار نہیں اُترا جا سکتا' جس طرح کہ میاں صاحب کہتے ہیں:

ایہہ دریا موہانے باجھوں لنگھن مول نہ ہوندا
رُڑھ مردا یا ڈُبدا جھڑا آپ ھکلا پوندا

ترجمہ:

''یہ دریا ملاح (مرشد) کے بغیر پار نہیں کیا جا سکتا' جو تن تنہا اس میں داخل ہوتا ہے' وہ یا تو بہہ جاتا ہے یا پھر ڈوب مرتا ہے......''

رستہ چھوڑ نبیؐ دا ٹریاں کوئی نہ منزل پگ دا
جے لکھ محنت دیویں کریئے کلر کول نہ اگ دا

ترجمہ:

''جس نے نبی کا راستہ چھوڑ دیا وہ کبھی بھی اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا' چاہے وہ لاکھ محنت کرے' کلر زدہ زمین پر کبھی کوئی پودا نہیں اگ سکتا......''

میاں صاحب نے اپنے قصہ سیف الملوک میں تصوف کی کئی ضروری اصطلاحوں اور مقامات کو الگ الگ بیان کیا ہے اور سالک و مرشد کے بارے میں اپنے خیالات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تصوف کی مختلف اور مشہور منزلیں مثلاً استغناء' توحید' حیرت اور فقر کے بارے میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود

صوفیاء کے دو گروہ ہیں جن میں ایک نظریہ وحدت الوجود یعنی ''ہمہ اوست'' کا قائل ہے جسے ''وجودیت'' کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور دوسرا نظریہ ''ہمہ از اوست'' کا پیرو ہے' جسے وحدت شہود بھی کہتے ہیں۔ میاں محمد بخشؒ اگرچہ نظریہ وحدت الوجود کے ہی قائل تھے' مگر ان کے اشعار میں ان کے اس عقیدے کے متعلق واضح طور پر پتہ نہیں چلتا۔ کیونکہ اُنہوں نے اپنے شعروں میں عقیدہ وحدت الوجود کا ذکر تو کیا ہے مگر بہت ہی کم ہے۔ آپ فلسفہ وحدت کے دونوں پہلوؤں کے قائل ہیں۔ آپ کے کلام میں فلسفہ ''وحدت الوجود'' اور فلسفہ ''وحدت الشہود'' دونوں کی مثالیں موجود ہیں۔

آپے دانا آپے بینا ھر کم کردا آپے
واحد لا شریك الٰهی صفتاں نال سنجاپے

ترجمہ:

"وہ خود ہی دانا اور بینا ہے' ہر کام وہ خود کرتا ہے' اس کا کوئی ثانی نہیں وہ وحدہٗ لاشریک ہے' انہیں صفوں سے پہچانا جاتا ہے۔"

اے سجناں تدھ باھجوں مینوں کوئی نظر نہ آوے
جت ول ویکھاں جلوہ تیرا ہر ہر تھاں سہاوے

ترجمہ:

"اے محبوب تیرے بغیر مجھے اور کوئی نظر نہیں آتا۔ میں جدھر بھی دیکھتا ہوں تو ہی نظر آتا ہے۔"

حکم تیرے بن ککھ نہ ھلدا جو چاھیں سو ھوندا
جس نوں آپ دلیری بخشیں اوہ میدان کھلوندا

ترجمہ:

"آپ کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا۔ وہی کچھ ہوتا ہے جو آپ چاہیں' صرف وہ میدان میں قائم رہ سکتا ہے جسے آپ ہمت بخشیں......"

تیری اوٹ پناہ خدایا ھور نھیں کجھ سُجھدا
جس دِیوے نوں آپوں بالیں کد کسے تھیں بُجھدا

ترجمہ:

"اے باری تعالیٰ تمہاری پناہ کے علاوہ مجھے اور کوئی نہیں سوجھتا' جس دیئے کو آپ روشن کریں اس کو کوئی بجھا نہیں سکتا۔"

سالک اس منزل پر پہنچ کر فنا کی منزل سے ہمکنار ہوتا ہے تو پھر اسے کسی بھی دنیاوی چیز کی کوئی ضرورت نہیں رہتی اور نہ کوئی چیز اپنی کشش سے اسے اپنی طرف متوجہ ہی کر سکتی ہے۔ کیونکہ وہ تو قال مقال سے گزر جاتا ہے اور وہ دونوں جہان کو بھول بھلا کر اسی واحد میں سما جاتا ہے۔

جنھاں اك گھٹ بھر کے پیتا وحدت دے مدھ لالوں
علم کلام نہ یاد رھیو نیں گزرے قال مقالوں

ترجمہ:

"جنہوں نے شراب وحدت کا ایک ہی گھونٹ پی لیا وہ اس قدر مست و مخمور ہو گئے کہ انہیں علم و کلام کچھ بھی یاد نہ رہا۔ وہ دنیا کی تمام باتیں بھول گئے۔ ہر قسم کی بحث و تکرار سے گزر گئے۔"

دوئے جھان بھلائے دِل توں خبر نہ رھی احوالوں
رانجھے وِچ سما محمدا! چھٹی ھیر جنجالوں

ترجمہ:

''انہوں نے اپنے دل سے دونوں جہان بھلا دیئے۔ انہیں کسی بھی چیز کی خبر نہ رہی۔ اے محمدؐ! ہیرا تجھے میں سما کر تمام جنجالوں سے چھوٹ گئی۔''

''رانجھا'' وجود حقیقی کی علامت ہے اور ہیر انسانی جسم کی روح ہے جو کہ اپنے حقیقی وجود سے ملنے کے لئے یعنی اپنے کل میں سمانے کے لئے سخت بے چین و بے تاب ہے:

جاں تـوں گـم هوویں وِچ اس دے اپنی چھوڑ نشانی
ایھــه تــوحید محمـّد بـخشـا! دسـے کـون نشانـی

ترجمہ:

''جب تم اپنی نشانی چھوڑ کر اس میں گم ہو جائے گا تو پھر تمہید توحید کا پتہ چلے گا۔ اس کی نشانی کوئی نہیں بتا سکتا۔''

نظریہ وحدت الوجود کا بانی محی الدین ابن العربی کو مانا جاتا ہے جو ۱۲۴۵ء میں فوت ہوئے جن کا فلسفہ یہ ہے کہ روح جز ہے اپنے کل کا اور روح یا جز اپنے کل سے ملنے کیلئے سخت بے چین و مضطرب ہے اور نظریہ وحدت الشہود کے بانی شیخ مجدد الف ثانی کو کہا جاتا ہے جن کا نظریہ ہے کہ خدا کے سوا کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن میاں صاحب نظریہ وحدت الوجود کے ہی قائل دکھائی دیتے ہیں:

کـامل عشق خـدایـا بـخشیں غیر ولوں مکھ موڑاں
هـکـو جـانـاں هـکـو تـکـاں، هـکـو آکھاں لـوڑاں

ترجمہ:

''خدا تعالیٰ مجھے ایسا کامل عشق بخش کہ میں غیر سے منہ موڑ لوں، صرف آپکا بن جاؤں۔''

آپــے رعیــت آپــے حــاکـم، مهـر اتــے پـٹـواری
کیهـڑا بــاشـا کـون بـئیرا کیهڑا میر شکـاری
آپــو آپ رهیــا اس گهر وِچ هـور شـریك نــه دوجـا
آپــے ٹهــاکـر نــام دهـرایــا آپ کـریـنـدا پـوجـا

ترجمہ:

''تم خود ہی رعیت ہو، خود ہی حاکم، خود ہی سردار اور خود ہی پٹواری ہو۔ باز کون ہے؟ بئیرا کون ہے؟ اور شکاری کون ہے؟

تم اس گھر (دل) میں اکیلے رہتے ہو (من میں بسے ہوئے ہو) اس گھر (دل) میں تمہارا شریک کوئی نہیں ہے۔ تم خود ہی ٹھاکر ہو اور خود اپنی پوجا کرتے ہو۔''

نــحــن اقــرب آپ کـو کیـنـدا هك دم دور نــه دســدا

اس دے ڈیرے اندر تیرے پھریں لوڑائو جسدا
محرم هوویں کون بھلاوے پڑدا ھے وچہ کس دا
جاں جاں دسے آپ محمدؐ تاں تاں آپ نہ دسدا

ترجمہ:

''خودنحن اقرب (میں تمہاری شہ رگ سے بھی قریب ہوں) کہہ رہے ہو۔ دور نہیں ہو۔ جس کو تم تلاش کر رہے ہو وہ تو تمہارے دل میں بس رہا ہے۔ جب تم خود محرم ہو تو پھر درمیان میں پردہ کس بات کا ہے تم خود ہی ظاہر ہو۔
''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی''

شان رسول اکرمؐ

واہ کریم امت دا والی مہر شفاعت کردا
جبرائیلؑ جیھے جس چاکر نبیاں دا سرکردا

ترجمہ:

''واہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیا شان ہے! جو امت کے والی ہیں اور مہر و شفاعت کرنے والے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ ہیں کہ جن کے ہاں جبرائیل جیسے مقرب و مقبول فرشتے کو اُن کے خادم ہونے کا شرف حاصل ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام انبیاء کے سردار ہیں۔''

اوہ محبوب حبیب ربانان حامی روزِ حشر دا
آپ یتیم یتیماں تائیں ھتھ سرے تے دھردا

ترجمہ:

''وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب اور دوست ہیں اور روزِ محشر کو ہم سب کی حمایت کریں گے اور ہم گناہگاران کی شفاعت سے ہی بخشش کے مستحق و سزاوار ٹھہریں گے۔ وہ خود یتیم ہیں لیکن یتیموں کے سر پر اپنا دست شفقت رکھنے والے ہیں۔ وہ شفیع بھی ہیں اور کریم بھی۔''

جے لکھ واریں عطر گلابوں دھویئے نت زُباناں
نام انہاں دے لائق نہیں کیہہ قلمے دا کاناں

ترجمہ:

''اگر لاکھ مرتبہ بھی گلاب کے عطر سے ہم ہمیشہ اپنی زُبان دھوتے رہیں تو تب بھی ہماری زُبان اُن کا نام لینے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ پھر اس نرڑے، سرکنڈے کے اس قلم کی کیا حیثیت ہے کہ یہ ان کی تعریف کر سکے۔''

سبھو نور اوسے دے نوروں اُس دا نور حضوروں
اس نوں تخت عرش دا ملیا موسیٰؑ نوں کوہ طوروں

ترجمہ:

''تمام نور اُسی کے نور سے ہیں اور اُن کا نور اللہ تعالیٰ کے نور سے جُدا کیا گیا ہے۔ اول ماخلق اللہ نوری کی جانب اشارہ ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو معراج میں عرش سے سب کچھ ملا اور حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر۔''

لولاك لما خلقت الكون آیا شان انهاندے
جن انسان غلام فرشتے دوئے جهان انهاندے

ترجمہ:

''لولاک لما خلقت الکون: ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ اگر میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پیدا نہ کرتا تو یہ کائنات کبھی نہ ہوتی۔ جن کی شان میں یہ آیا ہے کہ (اگر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیدا نہ کرتا تو یہ دنیا نہ پیدا کرتا) جن، انسان اور فرشتے اور یہ دونوں جہان اُن کے غلام ہیں۔''

آخر کار یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ آپؒ کے کلام میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں کا حسین امتزاج موجود ہے، لیکن وہ بہت محتاط ہیں......

ایهه اسرار نه پهولیں ایتهے مت کوئی مار گوائی
شاه شمس نے هکسے سخنوں آهی کهل لهائی
منه نِکّا تے گل وڈیری نه کر مت کوئی هسے
اعظمؒ شافیؒ مالکؒ حنبلؒ ایهه مسئلے نهیں دِسّے
وحدت دے دریا وِچ پینا کم نهیں هر هردا
لکھ جهاز ڈُبے پهر مڑ کے تخته باهر نه تردا
چیتا چیتا کنڈ نه دیویں عشق لڑائیوں اڑیا
سولے جاسی برخورداری جو اس سولی چڑهیا

(یہ بات اپنے دھیان میں رکھ لے کہ تو اس عشق کو میدان میں کبھی اپنی پشت نہ دکھانا، کامیابی وہی لے جا سکے گا جو اس کی سولی پر چڑھ گیا)۔

موتو اقبل ان تمو توا والا حرف صحیح جس پڑھیا
اس میدان محمد بخشا سر دِتّا لڑکھڑیا

ترجمہ:

"جس نے موتوا قبل ان تموتو (یعنی مرنے سے پہلے مرجاؤ) کا حرف صحیح پڑھ لیا، اے محمد بخشؒ اس میدان میں وہی کامیاب ہوا جس نے اپنی جان کی بازی لگا دی۔"

اسلوب بیان

ایک ناقد کا کہنا ہے کہ کسی شاعر کا اسلوبِ بیان اس کی شخصیت کا لازمی حصہ ہوتا ہے۔ میاں محمد بخش کے اسلوب بیان میں اُن کی شخصیت خوب رچ بس گئی ہے۔ اُن کے عشق ناکام، ایثار نفس، استغنا، بے ریائی، خلوص جذبہ اور سادگی نے اُن کے کلام میں کشش پیدا کی ہے۔ اُن کی شاعری بناوٹ یا آورد سے پاک ہے۔

میاں محمد بخشؒ کی زندگی کو خلوص اور سادگی نے پرکشش بنا دیا تھا۔ اسی سادگی اور خلوص نے اُن کی شاعری کو دلنشیں اور روح پرور بنا دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

دُکھیئے دی گل دُکھیا سندا قیمت قدر پچھانی
کسی دُکھیا جو دُکھیئے اگے دسّے نهیں وهانی
جیوں دُکھیئے نوں دُکھیا مل کے هنجوں بھر بھر روندا
سُکھے تائیں تك کے سُکھیا ایسا خوش نه هوندا
ماتم والے دے گھر ناریں جا منه پلّا پاون
دکھیا تکن تاں دُکھ اپنے پچھے باهجھ سناون
لکڑ اپنے رُکھوں وچھڑی تار وچھنّی سنگوں
دونویں رلیاں دسن لگیاں کوك سناون چنگوں

ترجمہ:

"جب ایک دکھیا دوسرے کو دیکھتا ہے تو جھٹ اس کے سامنے اپنا دُکھڑا رونے لگتا ہے جیسے عورتیں ماتم پرسی کے لئے کسی کے گھر جائیں تو بغیر پوچھے اپنی بپتا سُنانا شروع کر دیتی ہیں (اس کی وضاحت میاں بخش ایک خوبصورت تمثیل سے کرتے ہیں کہ) لکڑی اپنے پیڑ سے جدا ہوتی ہے اور تارا اپنے سنگ ساتھ سے بچھڑ جاتی ہے لیکن جب دونوں کے ملاپ سے سارنگی بنتی ہے تو اُس کی سروں میں اُن کا نالہ فراق گونج اٹھتا ہے۔"

میاں محمد بخشؒ کی تمثیلیں اور تشبیہات روز مرہ کی زندگی اور قریبی ماحول سے لی گئی ہیں اس لئے قابل فہم ہیں۔ صنائع بدائع کلام میں دلکشی پیدا کرتے ہیں۔ یہاں چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

شہزادی محل پر کھڑی اپنے چاہنے والے کا انتظار کر رہی تھی جیسے لوگ ماہ رمضان کی آخری شام کو عید کا چاند دیکھنے کے لئے بے تابانہ چھتوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں......

اُچے محل چبارے چڑھ کے ویکھے راہ سجن دے

جیوں آخر رمضان نماشیں چڑھن لوڑا وچن وے

عشق کو چھپانا ایسا ہی ناممکن ہے جیسے گود میں انگارہ چھپانا' مشک کو چھپانے کی کوشش کرنا یا دریا کے آگے بند باندھ کر اسے روک دینا۔

جھولی پا انگار محمدؐ کوئی بچا نہ سکے

عشقاں مشکاں تے دریاواں کون چھپائے ڈکے

خوشی غم میں اور غم خوشی میں بدلتا رہتا ہے جیسے رہٹ کے ٹنڈیں کبھی خالی ہو جاتی ہیں کبھی بھر جاتی ہیں۔

ٹنڈاں ھنجوں بھر بھر ڈوھلن جان اندر کر خالی

سدا نہیں اس رونق رھناں سدا نہیں خوشحالی

باغ میں چلتی پھرتی سرخ پوش عورتیں یوں لگتی ہیں جیسے ساون کی ہریالی میں بیر بہوٹیاں۔

ھکناں سرخ پوشاک تمامی پیراں تھیں لگ چوٹی

باغ ارم جیوں گھاہ ھرے وچ ساون چیج بھوٹی

باغ کی معطر ہوا میں لوگ نیند میں یوں بے خبر پڑے تھے جیسے پروا کے جھونکوں میں ناگ مست ہو جاتا ہے۔

نیندر مست پئی ھر زندے خوشبودار ھوایوں

جیوں چھجلپ ھووے مستانہ نرم پرے دی وایوں

عاشق کا علاج ساجن کے ملاپ سے ھے......

عاشق دا جو دارو دسے باجھ ملاپ سجن دے

اوہ سیانا جان ایانا روگ نہ جانے من دے

بدنصیب آدمی کی مثال ایسی ہے کہ وہ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ہل چلا کر بیج بوئے جب بادل آئیں تو اولے پڑیں اور کھڑی فصل تباہ ہو جائے۔

روڑا قھر قلور سرے تے سڑدے بیج رلایا

گڑے گوایا کھیت محمدؐ جس دن ساون آیا

حسینہ کے ہونٹ تراشے ہوئے یاقوت کی طرح سرخ تھے' ہونٹوں میں دانت یوں دکھائی دیتے تھے

جیسے شفق کی لالی میں تارے چمک رہے ہوں۔

سوھے ھوٹھ یاقوت کھرے تھیں کاریگر سنوارے
دند لباں وچ کجے آھے وچ شفق جیوں تارے

مرشد کی توجہ ایسی ہے جیسے خشک لکڑی سے بنایا ہوا الغوزا کہ اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے اور اس میں سوراخ بھی ہوتے ہیں لیکن جب کوئی ماہر نے نواز اس میں پھونک مارتا ہے تو اس میں سے رنگ برنگ کے نغمے مچلنے لگتے ہیں!

ویکھ الغوزا سُکّی لکڑی اگّی بالن والی
ھر ھر جائی رخنہ موری اندر سارا خالی
جاں مردے منہ لائی بھائی کج لئی ھر موری
نیک انیک آوازے نکلے پھوک جدوں وِچ ٹوری

شراب پی پی کے مست ہونے والوں کے چہرے مہتابی کی طرح دمک رہے تھے اور آنکھیں چراغوں کی طرح روشن تھیں:

بھر بھر پین شراب پیالے پی پی تھیون کھیوے
چھرے روشن مثل متابی نین بلن جیوں دیوے

حسینہ کے انگارے جیسے دہکتے ہوئے ماتھے پر کالی بندی یوں لگتی تھی جیسے نظر بد سے بچنے کے لئے حرمل کا دانہ آگ پر رکھا جائے۔ (کالی بندی نظر بد سے بچاؤ ہی کے لئے لگائی جاتی ہے)۔

متھا مگھے وانگ انگاراں اوپر بندی کالی
جیوں آتش پر حرمل دا نہ بدنظراں نوں ٹالی

جاں کنی کی حالت میں روح عذاب جھیلتی ہے جیسے گنا جو بیلن میں کچلا جا رہا ہو اور اُس سے گلو خلاصی کی کوئی بھی صورت ممکن نہ ہو......(روہ کا معنی گنے کا رس بھی ہے اور رہنا بھی ہے)۔

پکڑی جان عذابے اندر جیوں ویلن وچ گناں
آکھاں روھو نوں رھو محمدؐ ھن جے رھوے تے منّاں

میاں محمد بخشؒ جیسا شگفتہ اور اچھوتا انداز بیان کم شاعروں کے حصے آیا ہے۔ لطف بیان اور حسن ادا کے سبب وہ پنجابی شاعری میں امتیازی خصوصیت رکھتے ہیں۔

سیف الملوک شہزادی سے جدا ہو گیا ہے۔ شہزادی غمِ فراق اور جدائی میں کہتی ہے......

لد گئے دلدار دلے دے پھیر نہیں مڑ آئے
پھل دا بھار نہ جھلیا آھا رب پہاڑ سہائے

میں نے تو کبھی پھول کا بوجھ نہیں اٹھایا تھا اور خدا نے غموں کا پہاڑ مجھ پر رکھ دیا ہے......

شہزادے کا باپ اپنے بیٹے کا ایک بال لاکھوں کے عوض دینے کو تیار نہ تھا۔ آج وہی شہزادہ عشق کے ہاتھوں تنگ سے بھی ہلکا اور کمتر ہو گیا ہے۔

کی ہویا اج عشق تیرے نے ہو لا کیتا ککھوں

باپ اوہدے تہیں منگیا ٹوریں وال نہ دیوے لکھوں

ایک طرح وارلونڈی نازو انداز سے اٹھلاتی ہوئی ملکہ کے پاس آتی ہے......

واہ واہ گولی نازک ہولی پنجیں پھلیں تولی

سوہنی صورت سندر مورت ٹردی ٹور ممولی

چار کتاب سرے تے چلی گِن گِن پیر اٹھاندی

دلکے اگے نال گماناں مجرے کردی جاندی

ان چار مصرعوں میں ایک متحرک تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی ہے۔

ایک بہار کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیں......

شوقوں طوق پیا گل قمری کُو کُو کُوکے بولے

کوئل تاں لائی ہو اُچی کردے ناچ ممولے

بلبل طوطے سوہلے گاون حال پئے حیواناں

ڈھوہ دا کتا چنکی مارے بیل پھرے دیواناں

رہٹ کی ڈھول چکلی کو پیچھے کی طرف مڑنے سے روکنے کے لئے لکڑی کا "کتا" لگایا جاتا ہے۔ رہٹ چلتا ہے تو اس سے کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے، گویا "کتے" کی چنکی پر بیل حال کھیلتا ہے۔

بوڑھا باپ شہزادے کو رخصت کرتے ہوئے کہتا ہے......

کھندا بیٹا منگ منگ لدھوں کیھڑی جا نہ سوری

بڈھے وارے او سر ویلے ٹریوں بھن ڈنگوری

باپ کہتا ہے کہ میں نے تجھے کیسی کیسی منتوں سے پایا اور تم ہو کہ میرا عصائے پیری توڑ کر جا رہے ہو۔ اس شعر میں بوڑھے والدین کے دُکھ کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جو وہ نوجوان بیٹوں کی سرکشی پر محسوس کرتے ہیں۔

ایک محفل نا ؤ نوش کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کاسے ہتھ سفید بلوری بھرے عقیقی مدھ دے

ساقی نویں شراب پرانی نشے سوائے ودھ کے

ایک حسینہ کی چال کو مور کی چال کہا ہے اور مور کی چال کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے......

جیوں کر مور کریندا پائل سوھنے پیر ھلائے
گردن کلغی راس بنا کے گن گن پب اٹھائے

دوست کیسا ہونا چاہئے؟

سکھاں موجاں عیشاں اندر ھر کوئی یار کھاندا
سنگی سو جو تنگی اندر بنے پنجھال دُکھاں دا

ترجمہ:

''بھلے دنوں میں تو سبھی دوستی کا دم بھرتے ہیں' لیکن حقیقی دوست وہ ہے جو برے وقت میں ساتھ دے اور دُکھ بانٹے''......

اساں جیھاں دے منہ لگن تھیں تینوں شہرت آوے
ایھو جیھا رب بنایا چنگا کون بناوے

ترجمہ:

''ہم جیسوں کو منہ لگانے سے تمہیں شرم محسوس ہوتی ہے' ہمیں خدا نے ہی ایسا بنایا ہے' اس سے بہتر اور کون بنا سکتا ہے''......

سیف الملوک عاشقانہ ریت کو ترک نہیں کرتا بلکہ اس پر قائم ہے۔ اس کی محبت میں قطعاً کمی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کا عزمِ محبت قابلِ دید اور قابلِ داد ہے۔

یہی عزمِ مصمم آخرکار بدیع الجمال اور سیف الملوک کے درمیان حائل بعد کو دُور کر دیتا ہے۔ سچی محبت بدیع الجمال کے دل میں گھر کر لیتی ہے اور محبت کی راہ میں حائل دیواریں گر جاتی ہیں......

دُکھ سدا سُکھ گاہ بگاھاں دُکھاں تو سُکھ وارے
دُکھ قبول محمدؐ بخشا راضی رھن پیارے

ترجمہ:

''دکھ تو ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں اور سکھ کبھی کبھار ملتے ہیں۔ پھر بھی دکھوں پر سکھوں کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ اے محمد بخشؒ! مجھے دکھ ہی قبول ہیں بشرطیکہ ہمارے پیارے راضی ہیں۔''

مگر شکاری کرے تیاری بار چریندیاں ھرنا
جو چڑھیا اس ڈھینا اوڑک جو جمیاں اس مرنا

ترجمہ:

''جنگل میں چرتے ہوئے ہرنوں کے پیچھے لگنے کی تیاری شکاری کر رہا ہے۔ جو اوپر چڑھا ہے اس نے آخر نیچے گرنا ہے اور جو پیدا ہوا ہے' اس نے آخر مرنا ہے۔''

پینگھاں بہت ھُلارے چڑھیاں ترٹ زمیں تے جھڑیاں
کُڑیاں فیر نہ مُڑیاں پیکے ساھوریاں چھک کھڑیاں
موتی کد ملے مُڑ سِپّاں ونج پئے وچہ لڑیاں
ڈگیاں پھلیاں خاکو رلیاں پھیر رکھیں کد چڑھیاں

ترجمہ:

''جو پینگیں بہت بلندی تک جاتی ہیں وہ ٹوٹ کرز مین پر آ گرتی ہیں۔ وہ لڑکیاں جو بیاہی جا چکی ہیں ان کو سسرال والے لے گئے ہیں اب وہ وہیں کی ہو چکی ہیں۔ وہ پھر لوٹ کر سکے نہیں آ ئیں گی۔
جو موتی سمندری سیپیوں سے نکل کر کسی ہار کی لڑی میں پروئے جا چکے ہیں بھلا وہ دوبارہ کیا اپنے سیپیوں میں واپس جا سکتے ہیں؟ جو پھلیاں درختوں سے گر کر خاک میں رل چکی ہیں بھلا وہ دوبارہ درختوں پر کیسے چڑھ سکتی ہیں؟''

عذر بھانہ ٹردا ناھیں جو آکھے سو کریئے
ڈیگر نوں جے ڈھینا ھووے کاھنوں گُھل گُھل مریئے

ترجمہ:

''ہمارا کوئی عذر بہانہ نہیں چلتا اس لئے وہ جو کہے وہی کرنا پڑتا ہے۔ اگر عصر کے وقت چاروں شانے چت گرنا ہی ہو تو کس لئے کشتی لڑنے میں تگ و دو کرنی چاہیے' یعنی جان کیوں ماری کی جائے۔''

ویری دشمن موئے گئے دا ساہ وساہ نہ کریئے
سپ موئے دا کنڈا چبھے پھر بھی دردیں مریئے

ترجمہ:

''دشمن اگر مر بھی جائے تو پھر بھی ایک پل کیلئے اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے......
کیونکہ مرے ہوئے سانپ کا کانٹا بھی لگ جائے تو پھر بھی آدمی درد سے مر جاتا ہے۔''

ضرب المثل

میاں محمد بخشؒ کے بے شمار مصرعے اور شعر ضرب الامثال (کہاوت کی طرح مشہور) کا درجہ رکھتے ہیں۔ چند مصرعے بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ کامل لوگ محمدؔ بخشا لعل بنان پتھر دا
۲۔ چُوڑھے دا پُت مومن ھوندا جاں ملدا استاداں

۳۔ مِصری نال منه بھریا ہوئے' ریجھ رہے کد گُڑ دی
٤۔ کُکڑ بانگ نماشیں دتی' سمجھن کسُن تے آیا
٥۔ درد دھیاں دے ماسی ونڈے' یا پھر نانی دادی
٦۔ ملك الموت محمّد بخشا' منتیں کس منایا
۷۔ جس چیزے نوں لوڑن چڑھیئے' اوڑك اك دن ملدی
۸۔ چھوڑ تکبر منه پر پیندا ' جے کوئی اُچا تھکدا
۹۔ دوکھی لکھ محمّد بخشا' ساجن اك پیارا
۱۰۔ جس دن موت سپے دی آوے' پیندا آن کجائی
۱۱۔ ڈٹھیاں سُنیاں گلاں اندر' ہوندا فرق بتھیرا
۱۲۔ سپ دا ڈنگیا آکھ محمّد' رَسے کولوں ڈردا
۱۳۔ کتھے سکھ محمّد بخشا' بھرے جہان دکھاں دے
١٤۔ آکھ محمّد' کون مٹاوے' لکھیا لوح قلم دا
۱۵۔ ترکھے کم شیطانی ہوندے' کھن حکیم سیانے
١٦۔ کھری پچھے ھے کھن سیانے' اوڑك مت زنانی
۱۷۔ لسے دا کی زور محمد' نس جاناں یا روناں
۱۸۔ اس دنیا تے سدا نه رهنا' هر کوئی چلن والا
۱۹۔ ایڈا مان گمان نه کریئے' ڈاڈھے کولوں ڈریئے
۲۰۔ بے قدر اں دی الفت مندی' نیچاں دی اے شنائی
۲۱۔ جس نوں یار بنایئے آپوں' پھر اس تھی کی پڑدا
۲۲۔ سُن سہیلی کوئی نه بھاوے' جس دم بیلی آون
۲۳۔ عشق بے شرم محمّد بخشا' پچھ نه لاندا یاری
٢٤۔ لکھ کروڑ تیرے تھیں سوھنے' خاك اندر رل ستے
۲۵۔ آوے جد قضا محمّد' داناوں مَت مارے
٢٦۔ بریاں تھیں بریاں نکلے' ھے بھلیائی بھلیوں
۲۷۔بے پروا ھاں نال محمّد' زور نه اساں غریباں
۲۸۔تُد بِن ایویں جان محمّد' جیوں دِیوا بن تیلے
۲۹۔مَندے سَن دے روگ محمّد' مندے نھیں دواواں

کلام میں ادبی خوبیاں

میاں محمد بخشؒ شاعری کا انداز بیاں اپنی شگفتگی اور اچھوتے پن کے لحاظ سے منفرد اور نرالا ہے...... آپ کا کلام ادبی خوبیوں سے مالا مال ہے اگر ہم ان اوصاف کا احاطہ کرنا چاہیں تو نہ صرف مشکل ہے بلکہ محال ہے۔ یہاں اتنی گنجائش بھی نہیں ہے لہٰذا مختصراً تحریر ہے کہ......

آپ کا کلام جہاں سلاست، روانی اور تاثیر کا حامل ہے وہاں فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔ آپ کے نزدیک شاعری محض تک بندی اور قافیہ و ردیف کا نام نہیں بلکہ ایک فن ہے اور فن بھی ایسا کہ نہ تو سارے کا سارا اکتسابی ہے اور نہ سارے کا سارا وہبی۔ شاعری عطائے الٰہی بھی ہے اور محنت شاقہ کی محتاج بھی۔ آپ نے اسے اتنا سنوارا اور نکھارا ہے کہ کمال تک پہنچا دیا ہے۔

میاں صاحبؒ کے کلام میں مشاہدہ مہارت اور قادر الکلامی معراج پر ہے۔ ذخیرہ الفاظ گنج گراں مایہ کی صورت میں موجود ہے۔ صنائع بدائع / اقسام صنعت و تجنیس / رمز و کنایہ / تلمیحات و ترکیبات اور محاورات و ضرب الامثال پر آپ کو پورا عبور حاصل ہے جسے چاہیں تصرف میں لائیں۔ ایک ہی لفظ کو کئی معنوں میں پروتے چلے جاتے ہیں، صوری اور معنوی ہر دو لحاظ سے الفاظ کو مصرعوں میں پرونا آپ کے پیچھے ختم ہے۔

جاندا جاندا روح بدن وچہ رہیا پھیر اٹک کے
ھوش عقل دانائی ڈُبی پیکے پھیر اٹک کے
نال خیال جمال سجن دے عشق کمال ھویا سی
لال گلال نہال حسن دا حال بے حال ھویا سی
تاجوں راجوں کموں کاجوں آن ھوئی دلگیری
پٹ دو شالے بھاون ناھیں بھاوے ویس فقیری
پر ھك لیکھے آدم ڈاھڈا پتہ تساں نوں دیواں
ظاھر باطن پاکی ھووے پیش نہیں پھر دیواں
وَلوَل وَل پئے ول والاں وَل وَل ولی ولاون

آب حیات مونہوں گھت ظلمت ذوالقرنینؑ بھلاون
لچ لچ کردا منکا وچدا لک مہین بیانوں
پیر اٹھاوے تاں ول کھاوے اٹھدی ڈرے زیانوں
چاندی پیر تکے جد چاندی جاندی جان بچاندی
قد میں ڈھیندی عرضاں کھندی سجدیوں سیس نہ چاندی
اس دیواں نوں مار گرایا دیواں میں گواہی
سے دیواں ہر بھارا راکش کٹھا ایس سپاہی
کیتا جنگ نسنگ دوہاں نے مارے چنگ پکھیروں
سپ کل مار انگیار موہیں تھیں مارے ہو چوفیروں
پنکھی چھڑیاں مارے چھڑیاں اس بھی جوھیں چھڑیاں
چنج چلائے منج چوائے پنج پنج جائے پڑیاں
لگی لڑائی ناگ اڑائی ہووے چڑھائی دم دم
جھلن پھٹاں کر دے چھٹاں مارن سٹاں جم جم

ترجمہ:

''روح بدن سے نکل چلی تھی لیکن جاتے جاتے پھر اٹک کے رہ گئی مگر ہوش، عقل اور دانائی تو دریائے اٹک کے بھیر میں ڈوب گئی۔

محبوب کے جمال کے خیال کے ساتھ بھی اتنا کمال درجے کا عشق ہو گیا ہے کہ وہ باغ حسن کا نونہال سرخ لعل یعنی چمک دمک اور تروتازگی کا مالک شہزادہ اپنے حال سے بے حال ہو گیا۔

تاج راج اور کام کاج سے اس کا دل بیزار ہو گیا پٹ دوشالے (ریشمی اور قیمتی پارچات و ملبوسات) سے اسے نفرت ہو گئی اور فقط فقیری لباس پسند آنے لگا۔

بہرام دیو نے ملکہ خاتون سے کہا کہ ''سنو! یہ بات تمہیں بتا دوں کہ ایک لحاظ سے بنی آدم (ہم پر) غالب ہے۔ اگر اس کا ظاہر و باطن پاک ہو تو دیوؤں کی اس سے کوئی پیش نہیں جاتی۔''

شاہ پری کے بل دار بالوں کی تعریف کی جا رہی ہے کہ شاہ پری کے بل دار بالوں میں زنجیر کی طرح پیچ در پیچ اتنے حسین اور دلکش پیچ تھے کہ ولیوںؒ کو بھی گھیر گھار کر ورغلا لیتے تھے یعنی اس کا حسن زہد شکن تھا۔ اس گوری کے منہ مبارک کا غار گویا چشمہ آب حیات تھا۔ جس پر کالی کالی زلفوں کی گھٹا ظلمات کا سماں پیدا کر دیتی تا کہ وہ چشمہ ذوالقرنینؑ کی آنکھوں سے اوجھل رہے

اور ظلمات کا دھوکہ کھا کر پلٹ جائے تا کہ خضرؑ کی امانت برقرار رہے یعنی پری صرف سیف الملوک کی امانت تھی۔

یہاں ول کا معنی پیچ بھی ہے' بہلانا بھی اور بار بار بھی۔

شاہ پری کی ریڑھ کی ہڈی کا وچلا منکا (درمیانی مہرہ) لچ لچ کرتا تھا (نہایت نازک اور لچکدار تھا) اور کمر مبارک (مٹھی میں آنا تو در کنار) حد بیان سے بھی باریک تھی۔ وہ نازک اندام خراماں ناز جب قدم اٹھاتی تو نزاکت سے بل کھاتی۔ اگر کسی نشست سے اٹھتی تو اپنی نزاکت اور مخمور جوانی کی وجہ سے اس نقصان سے ڈرتی کہ اہل عشاق ہلاک نہ ہو جائیں۔

شاعر کے تخیل نے جھانجر کو جو اصلاً چاندی کی ہے' آنکھیں دے دی ہیں۔ شاہ پری جب باری باری قدمین شریفین اٹھاتی تو ایڑیوں سے نیچے جھکی ہوئی چاندی کی پازیب کی نظر تلووں پر پڑتی اور وہ شاہ پری کے خوبصورت گورے گورے تلووں کی چاندی سے نہ صرف شرمندہ ہو جاتی ہے بلکہ عجز و نیاز سے قدموں میں ڈھ ڈھ (گر گر) کر سجدے پہ سجدہ کرتی کہ مجھے اپنی غلامی ہی میں رہنے دو۔

ملکہ خاتون شہزادے کی شجاعت کی تعریف کرتی ہے" میں گواہی دیتی ہوں شاہزادہ اتنا بہادر ہے کہ اس نے بڑے بڑے دیوؤں کو مار گرایا ہے۔ کیونکہ اس مرد میدان سپاہی نے میری آنکھوں کے سامنے بہرام شاہ جیسے طاقتور راکش کو ہلاک کیا ہے جو سینکڑوں دیوؤں پر غالب تھا۔

اژدھا اور کوہ پیکر کے مابین جنگ کا نقشہ پیش کرتے ہیں اصل شعر میں الفاظ کی تکرار اور جھنکار ملاحظہ ہو۔" دونوں نے خوب جنگ نسنگ کیا پکھیرو چونچیں مارتا تھا جبکہ سانپ جو کل مارنسل کا تھا منہ سے آگ کے شعلے برساتا اور چاروں طرف سے گھیر گھیر کر حملے کرتا۔"

پنکھی نے بھی آخر جنگل جو ہیں گاہی ہوئی تھیں وہ اپنے پنجوں کی چھڑیاں چھڑیوں کی طرح مارتا اور بڑے غضب سے چنجیں مار مار منج نکالدیتا۔ ہٹ ہٹ کر حملہ کرتا اور ہر حملے میں چنیے کی طرح ناگ کے جسم کو پیچ کرر کھ دیتا۔

یہ عجب لڑائی ہے ناگ پھنکارتا ہے اور بار بار چڑھائی کرتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے پر جھپٹ مارتے اور پھٹ جھیلتے ہیں اور جم جم کرٹیں مارتے ہیں۔"

شہزادے کی اس وقت کی تصویر دیکھئے جب اس کا حسن مردانہ بھرپور ہو چکا ہے اور وہ سفرِ عشق کے مصائب جھیلنے کے بعد پری بدیع الجمال کے پاس پہنچ چکا ہے۔ پری کی نگاہ اس کے مہتابی جمال پر پڑتی ہے تو یوں سمجھئے کہ صیاد خود اپنے صید کا شکار ہو جاتا ہے۔ ذرا میاں محمد کے انتخابِ الفاظ کی بھی داد دیتے جائیے......

لہ لہ کرے شعاع متھے دا، جوبن جوت مہتابی
مرگ جنگل دے ھار سنگارے، گوھڑے نین شرابی

ترجمہ:

''ایک شعر میں کتنی درخشانیاں اور کتنی مستیاں بھردی ہیں۔تعریف وتشریح نہیں ہوسکتی۔''
لہ لہ' شعاع' ماتھا' جوبن' جوت اور مہتابی سب کے سب کس قدر چمکتے ہوئے اور متناسب الفاظ ہیں......مرگ (آہو) گوہڑے (گہرے رنگ کے) نین (آنکھیں) اور شرابی ایک دوسرے پر نشے کی بارش کررہے ہیں۔''لہ لہ'' کو دیکھ کر بلھے شاہ کا مصرع یاد آجاتا ہے

تیرے عشق نچایا کر تھیّا تھیّا

جس طرح اس ''تھیّا تھیّا'' کا ترجمہ نہیں ہوسکتا۔اسی طرح ''لہ لہ'' بھی خود ہی اپنی تشریح ہے۔

نازک سوھنا بدن گلابوں' رنگ رس بھریا بنّاں
حسن جمال کمال اُھدے دا' ناں کوئی حد نہ بنّاں

ترجمہ:

''اس شعر میں تجنیس تمام کس بے تکلفی سے کھپ گئی ہے' پہلاں ''بنّاں'' نوشہ کے معنی میں ہے اور دوسرا کنارے کا مفہوم ادا کررہا ہے۔یعنی شہزادہ کیا ہے' ایک خوبصورت نازک بدن دولہا ہے جس کے حسن و جمال کی کوئی حد ہے نہ کنارا۔''

جاں مکھ طرف زمیں دے کردا' ھندی دھرت نورانی
جاں مڑ اُچا کرکے دیکھے' لاٹاں چڑھن آسمانی

ترجمہ:

''جب وہ زمین کی طرف رُخ کرتا ہے تو زمین اس کے فروغِ حسن سے چمک اُٹھتی ہے اور جب اُوپر کو دیکھتا ہے تو آسمان کی طرف شعلے چھوٹنے لگتے ہیں۔میرے نزدیک حسن کی تعریف میں یہ مضمون نیا ہے۔''

عشرت عیش سبھی کچھ کدھا' یاد نہ اکھیں ڈِٹھا
جاں جاں یار نہ ملے محمدؐ' کج نہ لگدا مِٹھا

ترجمہ:

''یہ ''کج نہ لگ دا مٹھا'' منزلِ محبت کے سالکوں کا کتنا سچا تجربہ ہے۔کیا دنیا کی کسی زبان میں وہ الفاظ ہیں جو اس کیفیت کی پوری ترجمانی کرسکیں......''

عاشق نوں اِہ مال خزانے' تخت حکومت شاہی
دلبر باجھوں اینویں دِس وے' جیوں چوراں گل پھاہی

''جیوں چوراں گل پھاہی'' کی داد دینا ضروری ہے......

میاں صاحب کے اسلوب بیان کا ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ ہمیشہ ایسے الفاظ و تراکیب کا استعمال کرتے ہیں جن میں ترنم اور موسیقیت پائی جاتی ہے اور بعض اوقات تو آپ صوتی مناسبت کا اس قدر اہتمام بھی کرتے ہیں کہ ایک ہی طرح کے الفاظ مختلف معنوں کے ساتھ لے آتے ہیں۔

پری شاہزادے سے بچھڑ کر باغ سے اپنے خیمے میں آ جاتی ہے اور چادر تان کر بستر پر لیٹ جاتی ہے پھر اندر ہی اندر رو رو کر خستہ حال ہوتی ہے اس موقع پر دو شعر ملاحظہ فرمائیں......

منہ پر پلا محرم اللہ اندر درد اولا
ایہہ تن نال سجن دے آہا ہن کیوں پیا اکلا
قہر قلور نزول اندر وچہ سول ڈنڈول وچھوڑا
نویں جوانی ھڑدا پانی زور نہ کردا تھوڑا

غور فرمائیے کہ لفظوں کی پروقار صوتی جھنکار میں کتنی بہار ہے......

میاں محمد بخشؒ کے اسلوب بیان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مترنم الفاظ و تراکیب لاتے ہیں اور بعض اوقات صوتی مناسبات کا اہتمام بھی کرتے ہیں' تاکہ کلام میں اثر آفرینی پیدا ہو سکے۔

چمکن سالو' لعکن واگاں' چھٹنکن چوڑے سُچے
جوڑ مروڑ کڈھن لك پتلے لٹك کرن قد اُچے

میاں صاحب نے اپنی شاعری میں علم بیان اور صنائع بدائع کا جا بجا استعمال کیا ہے اور علاوہ ازیں اُنہوں نے بے شمار نئی تراکیب اور نئے الفاظ بھی وضع کئے ہیں۔ اُنہوں نے ایک ایک لفظ کو کئی کئی معنوں میں استعمال بھی کیا ہے اور کہیں کہیں تو وہ صنعت تجنیس کے بادشاہ فضل شاہ نواں کوٹ والے کی مانند دکھائی دیتے ہیں۔

میاں محمد بخشؒ سالکِ راہ حقیقت تھے اور صوفیہ وجودیہ کی طرح ذاتِ مطلق میں فنا ہو جانے کے آرزومند تھے۔ وہ اس عالمِ بے بقا کی اصلیت سے بخوبی واقف تھے اور جانتے تھے کہ دوستوں کی محفلیں' حسن و شباب کی سحر کاریاں' عشاق کی پرشوق ملاقاتیں' عزیزوں کی صحبتیں جھوٹے سنسار کی جھوٹی کرشمہ کاریاں ہیں۔ ان کا سوچا سمجھا ہوا عقیدہ تھا کہ صرف عشق ہی فنا پر غالب آ سکتا ہے عشق ہی انسان کی بقائے دوام کا ضامن ہے۔

سدا نہ رُوپ گلاباں اتے سدا نہ باغ بہاراں

سدا نہ بھج بھج پھیرے کرسن طوطے بھور ہزاراں
چار دھاڑے حسن جوانی مان کیتا دلداراں
سکدے اسیں محمد بخشا کیوں پرواہ نہ یاراں

ترجمہ :

''یہ گلاب کے پھول کی رنگت اور روپ ہمیشہ نہیں رہے گا اور نہ ہمیشہ یہ بہار ہی رہے گی۔ اور نہ ہمیشہ یہ طوطے اور بھنورے ہی بھاگ دوڑ کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہ جوانی کا غرور چار دن کی بات ہے' اور محبوبوں کا غرور کیا معنی رکھتا ہے؟ اے محمد بخشؒ! ہم آرزو میں ہی مرتے جا رہے ہیں اور ہمارے یاروں کو ہماری کیوں کوئی پروانہیں ہے؟''

مزاحیہ انداز

میاں محمد بخشؒ کا یہ فنکارانہ کمال قابلِ داد ہے۔ وہ ہر بڑے شاعر کی طرح مزاح سے بھی بہرہ ور ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال حبشیوں کی شہزادی کے احوال میں ملتی ہے۔ جو شہزادہ سیف الملوک پر فریفتہ ہو جاتی ہے اور اُسے رجھانے کے لئے نازو ادا سے کا لیتی ہے۔ اُس کی بدصورتی کا نقشہ کھینچنے کے بعد میاں محمد بخشؒ کہتے ہیں:

لاڈ کریندی ڈُھک ڈُھک بہندی کھندی ہے دلجانی
بَن بن دسّے میرے جیہی ڈٹھیا کوئی زنانی
توں شہدا پردیسی بندہ ایہ نعمت تدھ کتھوں
ایویں پھر پھر مویوں کتھاویں طالعے جاگے اِتھوں
توں چندر میں زہرہ وانگر دوہاں نویں جوانی
ساعت نیک پھری ہن تیری ہوئی اج قرانی
توں گُلبن میں چنبے ڈالی میں موتی توں ہیرا
توں الوان سرخ میں نینوں' میں سالو توں چیرا
جوڑی اج خداوند جوڑی' توں راجہ میں رانی
میں بن اگّے تدھ اکلّیاں کیوں کر عمر دھانی

ترجمہ :

''حبشن ادائے خاص سے سیف الملوک سے لگ کر بیٹھتی ہے اور پوچھتی ہے میری

جان سچ بتا تو نے کبھی میری جیسی حسین عورت اس سے پہلے بھی دیکھی ہے؟ تو غریب
میرے حسن و جمال کی کیا قدر کرے گا۔ تو ناحق اِدھر اُدھر جھک مارتا پھرا۔ مجھ سے
مل کر تیرے نصیبہ نے یاوری کی ہے۔ بیشک تو چاند کی طرح خوبصورت ہے لیکن میں
بھی تو حسن کی دیوی زہرہ ہوں۔ ہم دونوں نوخیز ہیں۔ تیری خوش قسمتی ہے کہ تیری
میری ملاقات ہوئی۔ تو گلاب کی شاخ میں چنبیلی کی ٹہنی ہوں۔ تو ہیرا ہے میں ہوتی
ہوں۔ تو سرخ الوانی (ایک ریشمی کپڑا) ہے میں نینوں (ایک قیمتی ریشمی کپڑا) ہوں تو
چیرا (سر پر باندھنے کا حریری پٹکا) ہے۔ میں سالو (سرخ کڑھائی کا کپڑا) ہوں۔
خدا نے میری تیری جوڑی خود بنائی ہے۔ تو راجہ ہے میں رانی ہوں اور پھر اُس عورت
کے انداز میں پوچھتی ہے جسے اپنے حسن پر بڑا اعتماد ہو میری محبت سے دور اکیلے میں
تو کیسے زندگی گزارتا رہا۔ اس مزاح میں الننا کی (Pathos) کا رنگ بھی پیدا ہو گیا
ہے۔ جبکہ پر ہنسی بھی آتی ہے اور رحم بھی محسوس ہوتا ہے۔''

سراپا نگاری

سراپا نگاری میں سر سے پاؤں تک محبوب کے تمام اعضاء کی تعریف کی جاتی ہے۔ یہ فن جس قدر عام ہے اسی قدر مشکل بھی ہے اور اس میں یہ فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ کون کتنا بڑا شاعر ہے۔ میاں محمد بخشؒ اس مشکل سے بھی کامیاب و کامران ثابت ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی سراپا نگاری کا کمال پری بدیع الجمال اور ملکہ خاتون کے حسن کی تعریف میں خوب دکھایا ہے۔

سراپا نگاری سے میاں صاحب کی دلچسپی کا عالم یہ ہے کہ کئی صفحات پر محیط سراپا سے بھی ان کی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ بدیع الجمال اور بدرہ خاتون کے حسن کے ہر نقش کو انہوں نے اپنے موئے قلم سے یوں اُجاگر کیا ہے کہ ہر نقش میں حسن کی ہزار شیوہ ادائیں سمٹ آئی ہیں۔

شمع پتنگ جلاون والی گرم لقا پری سی
بہتا جھکے نیواں تکے شرم حیا بھری سی
شوخ آشوب جگت دا فتنہ شور انگیز جہانوں
مٹھی جیبھ ملیح سلونی بہت پیاری جانوں
نِکّی نکّی چال لڈکی ہنساں کھگاں جیہی
رنگ گلابی شکل مہتابی پھلیں تلدی دیہی

مِٹھا ھاسہ ماسہ ماسہ دند نہ کردی ننگے
صاف لمیں تے پتلی گوری گردن مثل کلنگے

ترجمہ:

"وہ گرم لقا پری پتنوں کو جلانے والی شمع تھی۔ وہ زیادہ شرماتی اور نیچا دیکھتی' وہ شرم وحیا کا پیکر تھی۔ وہ شوخ تمام جہان کے لئے فتنہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی زبان شیریں اور نمکین تھی اور وہ خود مجسمۂ حسن' اس کی دھیمی اور ہنستی کھیلتی چال' ہنسوں اور کھگوں' کے مانند رنگ گلابی' شکل مہتابی سی اور جسم پھولوں جیسا نرم ونازک تھا۔ وہ زیرِ لب ایسے دلنواز انداز سے مسکراتی کہ دانت نظر نہ آتے۔ اس کی صاف لمبی پتلی' گوری گردن کلنگ جیسی خوبصورت تھی۔ وہ طوطی اور قمری سے بڑھ کر حسین کوئل کی مانند خوش آواز تھی۔ اس کی آواز کٹورے کی سی کھنک رکھتی تھی۔ اور وہ گفتگو یوں کرتی جیسے موتی بکھیر رہی ہو۔

بدیع الجمال کی طرح بدرہ خاتون کی رعنائی وزیبائی کے بیان میں بھی پورا زورِ قلم دکھایا گیا ہے۔

اچّی لمّیں نازک گوری نرم چنبے دی ڈالی
ناز ادا تے آن کرشمہ صفت خداوند والی
پلکاں تیر آھا نک پتلا خنجر سان چڑھائی
مِٹھے ھوٹھ صلح وچہ راضی غمزہ کرے لڑائی
تھوڑا ھسّے تے دل کھسّے وَسّے وچہ مناں دے
بدرہ گوری ھسے چوری جیونکر شرم زناں دے
آن ادا حسن دیاں لھراں شان گمان وڈیرا
ساری صفت بیان کرن دا قدر نہیں کجھ میرا

ترجمہ:

"وہ چنبے کی ڈالی جیسی اونچی لمبی' نازک' نرم اور سفید تھی۔ اس کے ناز وادا' آن بان میں حسن خداوندی کی کرشمہ سازی جلوہ گر تھی۔
اسکی پلکیں تیر جیسی اور پتلی ناک سان چڑھا خنجر۔ اس کے شیریں ہونٹ صلح جو لیکن غمزے جنگجو تھے۔ وہ کم کم مسکراتی اور دل موہ لیتی تھی۔ وہ نسوانی شرم وحیا کے سبب چوری چوری ہنستی تھی۔ اس کی آن بان اور ناز وادا میں حسن کی لہریں موجزن تھیں۔ اس کے شان و گمان میں کوئی حد ہی نہیں تھی۔ اس کی ساری صفات کا بیان میرے بس کا روگ نہیں۔

سرانديپ کے بادشاہ کی لڑکی ملکہ خاتون جو ایک دیو کی قید میں ہے' جب شاہزادہ وہاں پہنچتا ہے تو

وہاں دیو کے سحر کی تاثیر سے وہ بے ہوش سو رہی ہوتی ہے۔ وہ اس کے چہرے سے آنچل اٹھا کر اس کے حسن کا مطالعہ کرتا ہے۔ شاعر کا زورِ بیان دیکھیے۔

١۔ سورج وانگ نورانی متھا تاب نہ جھلّی جاوے
٢۔ جے پتھر دل والا تکّے اکھیں پانی آوے
٣۔ قوس قزح بھروَٹے دونویں جیوں عیدیں چن چڑھ دا
٤۔ یا جیوں ہووے ہلال فلك وا دُور ھنیرا کھڑدا
٥۔ یا دو طاق بہشتی آھے بھنّے رنگ کستوری
٦۔ یا خم دار کمان آب نوسی گھائل کرن ضروری
٧۔ پلکاں تیر خدنگی آھے سوھنے تے لاثانی
٨۔ ڈٹھیاں سار کلیجہ سلن جیوں ترکش دی کانی
٩۔ لٹك رھے سن ناگ ایانے سوھنیاں زلفاں والے
١٠۔ پاندے پیچ دلاں دے تائیں کالے تے متوالے
١١۔ اکھیں تیز کٹار فولادی آھیاں وِچ میاناں
١٢۔ اك غمزے تھیں باجھ بیاناں قتل کریندیاں جاناں
١٣۔ نك انگشت بنی الله دی تیز چھری تلواروں
١٤۔ طرف فلك دی کرے اشارت معجزیاں دے پاروں
١٥۔ چن دوکھن دونویں کن آھے بندیاں نال سنگارے
١٦۔ بندے بندے پھب دے آھے مثل زحل سیّارے
١٧۔ سوھے ھونٹ یاقوتوں گھڑکے کاری گراں سنوارے
١٨۔ دند لباں وچ ایوں پوشیدہ جویں شفق وچ تارے
١٩۔ ٹھوڈی سیب بہشتی باغوں سوھا رنگ عنابوں
٢٠۔ گردن مثل بلور صراحی جیوں کر بھری شرابوں

یہ سلسلہ آگے سے آگے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ شاعر کی طبع رواں کہیں رُکتی اور جھکتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اوپر کے بیس شعروں پر نمبر اس لئے لگائے گئے ہیں کہ قارئین کو نمبر وار تشبیہات کی طرف متوجہ کیا جا سکے۔

ا...... چمکتے ہوئے ماتھے کو خورشید درخشاں سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہ تشبیہ خود ہی بتا کر اس کو مکمل کرتے ہیں نا اول یہ کہ اس کو دیکھنے کی تاب نہیں اور سورج کو دیکھ کر آنکھوں میں پانی آ جانا دوسری وجہ ہے۔

۳ تا ۴...... ابروؤں کے لئے پانچ تشبیہات مہیا کی ہیں۔ قوس قزح' عید کا چاند' ہلال فلک' (آخری دو

دراصل ایک ہی ہیں) بہشت کے دو طاق جن پر کستوری کا رنگ کیا ہوا ہے۔ آبنوس کے بنے ہوئے خم دار کمان..... واضح ہو کہ کستوری اور آبنوس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔

۱۳۔۱۴..... ناک کے لئے نئی تشبیہہ ایجاد کی ہے۔ یعنی حضرت پیغمبر صلعم کی انگشت مبارک جس کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے بیان کئے گئے ہیں۔ اس میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ چہرہ درخشاں پورا چاند ہے۔ ناک نے درمیان میں آ کر اس کے دو حصے (رخسارے) کر دیئے ہیں۔

۱۷۔۱۸.....لب کو یاقوت سے عام طور پر تشبیہہ دی ہی جاتی ہے لیکن اگلی بات کہ چمکتے ہوئے دانت سرخ ہونٹوں کے اندر سے اس طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے شفقِ شام میں ستاروں کی نمود غالباً انگوٹھی اور خوبصورت تشبیہہ ہے۔

شہزادہ دیو کو قتل کر کے اس حسینہ کو اس کی قید سے چھڑا کر لاتا ہے اور سفر کی مشقتیں برداشت کر کے اُسے وطن میں پہنچاتا ہے۔ وہاں اس کی بہن بدرہ خاتون اور دونوں کی ماں سے ملاقات ہوتی ہے۔ بدرہ خاتون کی صفت میں بھی بہت سے شعر لکھتے ہیں۔ نمونہ دیکھئے اور شاعر کی روانی طبع پر تحسین کے پھول نچھاور کیجئے۔

رنگ گلابی' انگ حسابی چھرہ دانگ مھتابی
جُسّے تھیں خوشبوئی حُلّے اکھیں مست شرابی
اچی' لمی' نازک' گوری نرم چنبے دی ڈالی
ناز انداز تے آن کرشمہ صفت خداوند والی

الفاظ کی نشست اور معانی کی پیوست ملاحظہ فرمائیے۔ پھر اندازہ کیجئے کہ اساتذہ عجم نظامی، خسرو، جامی کی روح پنجابی جسم میں سرایت کر رہی ہے یا نہیں؟.....ان اشعار کی اس کے سوا کیا تعریف کی جائے کہ ذہنِ شاعر سے صفت خداوند والی جلوہ گر ہو رہی ہے۔ اگر حسن اپنے خالق کی صفاتِ حسنیٰ کا آئینہ دار ہے، تو بیانِ حسن بھی اس سے کم آئینہ داری نہیں کرتا۔

بدیع الجمال پری کے جمال کی تعریف میں بیسیوں اشعار لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے چند ملاحظہ فرمائیے.....

درس جمال اوھدے دی پڑھدے سورج' انبر' تارے
متھا صاف رُپھری تختی رکھن پکڑ کنارے

سورج، آسمان اور ستارے شاگردوں کی طرح اسکے حسن و جمال کا سبق پڑھتے ہیں۔ سبق کی مشق کے لئے طالب علموں کو تختی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فائدہ جبیں کی لوحِ سیمیں سے اُٹھایا جا رہا ہے..... تختی کے لئے حروف کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب حروف لکھے جا رہے ہیں.....

اس تختی پر لکھے آھے نال سیاھی کالی

خوش خط عربی نون دو پاسے کافی قدرت والی

اس لوحِ جبیں پر سیاہ روشنائی سے کلکِ قدرت نے دونوں عربی رسم الخط میں تحریر فرمائے ہیں۔ یہ ہیں دو ابرو جو نونِ معکوس کی شکل میں نظر آ رہے ہیں۔

نونان ہیٹھ عجائب سوھنے دونویں صاد لکھے سَن

آفرین ھزاراں اس نون جس استاد لِکھے سَن

آگے بڑھے تو نونوں کے نیچے صاد لکھے دکھائی دیں گے۔ یہ ہوئیں آنکھیں،

اس تختی دے دندے دندے دونھہ جیماں دے دو گھیرے

جیم جمال اندر خوش نقطے کالے خال لٹیرے

اب اس تختی کے دونوں جانب سے دو جیموں کے دائرے شروع ہوتے ہیں، جن کے اندر خالِ سیاہ نقطوں کا کام دے رہے ہیں۔ یہ دو رخسار۔

اسی طرح آگے بڑھتے گئے ہیں اور حروف بناتے گئے ہیں۔ چہرے کی عام تعریف کرتے ہیں۔

مکھ محبوباں دا بیت اللہ اُہ محبوب اُچیرے

کرن نماز نیازاں عاشق سجدے دین چوفیرے

قامت کے متعلق فرماتے ھیں......

اُچا قد رنگیلا تک کے سرد آزاد پیارا!

پیراں بھار حیران کھلوتا ھویا قید بچارا

اسکے قدِ بلند و رنگیں کو دیکھ کر سروِ آزاد پاؤں کے بل حیران کھڑا ہے۔ بے چارہ قیدی ہو گیا۔

قدموں کی نزاکت و رنگینی اور خرامِ ناز کی تصویر ملاحظہ طلب ہے......

ٹھم ٹھم کر دی دھرتی دَھردی نازک پَیر گلابوں

مھندی رنگے جیوں پَٹ لچھے آون شھر خوشابوں

جے عاشق دیاں نیناں اُتے رکھے لاڈ عتابوں

پُر پُر چھالے ہون محمدؒ اتھرواں دے آبوں

اس سے آگے نزاکت کیا ہو سکتی ہے کہ پائے نازک عاشق کے اشک آلود اشکوں پر رکھ دے تو آنسوؤں کی گرمی سے تلووں میں چھالے پڑ جائے۔

میاں محمد بخشؒ جب سراپا نگاری کرنے پر آتے ہیں تو پھر وہ صفحوں کے صفحے سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے عام شعرا کی طرح سراپا نگاری نہیں کی کیونکہ ان کی سراپا نگاری میں بھی ایک انفرادیت اور عالمانہ شان نظر آتی ہے۔

منظر نگاری

میاں محمد بخشؒ وصف نگاری کے بھی بادشاہ ہیں اور ایک استاد مصور کی طرح منظر کشی کی ہو بہو تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔کوئی مصور لاکھ کوشش کرے رزم و بزم کی تصویر شاعر سے بڑھ کر نہیں بنا سکتا۔ایسا ہی ایک منظر جس کی میاں صاحب نے تصویر کھینچی ہے درج ذیل ہے:

سیف الملوک میں منظر نگاری اور سراپا نگاری کے بہت سے سحر آفرین نقوش نظر آتے ہیں۔منظر نگاری میں تو سیف الملوک کی نظیر مشکل سے ہی ملتی ہے۔میاں صاحب نے منظر نگاری کو حقیقی زندگی کے بہت قریب کر دیا ہے۔ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب کشمیر کا حسین و جمیل ماحول ہے۔ان کے چاروں طرف ایسے فطری مناظر تھے۔

سبزیوں سبز پوشاک زمیں نوں وانگن نیکو بختاں
ہر ہر پاسے پانی نہراں لایا رنگ درختاں
میوہ دار پکی ہر ڈالی لٹک زمین پر آئی
گل پھل رنگ برنگی پھلے رونق جوہ سہائی
کوئل مور چکور ہزاراں خوش آواز لٹورے
طوطے قمری کالے تتر بولن وانگ کٹورے
ہتھ کھلار چنار کھلوتے زاہد ہار کنارے
کرن دعائیں مولیٰ سائیں پری وکھا کے مارے
اُٹھ اُٹھ نمدی شاخ چنبے دی جیوں گورو ول چیلا
گل عباسی ماراداسی کھے نشے دا ویلا
رنگا رنگ بہار پھلاں دی جیوں کُڑیاں وچ میلاں
بھر بھر چھج پھلاں دے کڈھن ویلاں دین رویلاں
سرو قیاماں وچہ کھلوتے نیتے شکر دو گانے
شاخاں مکھ زمیں پر رکھے کر سجدے شکرانے
نہراں خشک ہویاں پھر جاری دھوتی دھوڑ غماں دی
سبزی تیز زباناں کرکے حمد بجا لیاندی

ترجمہ:

''سبزے نے زمین کو نیک بخت لوگوں کی مانند پوشاک پہنا دی۔ہر طرف پانی کی نہریں جاری تھیں اور سرسبز و شاداب درخت تھے۔میوے دار پکی ہوئی ہر ڈالی زمین کی طرف جھکی

ہوئی تھی۔ رنگا رنگ کھلے ہوئے پھول عجب بہار دکھا رہے تھے۔
خوش آواز کوئل مور' چکور' ہزار لٹورے' طوطے' قمری' کالے تیتر کانوں میں رس گھول رہے تھے۔
کنارے کنارے ہاتھ پھیلائے چنار زاہد کی طرح کھڑے دُعا مانگ رہے تھے کہ اللہ تعالی پری
کا وصال عطا کر۔
چلیے کی شاخ یوں جھک جھک جاتی تھی' جیسے گورو کے سامنے چیلا۔ گل عباسی جمائیاں لیتا کہتا
تھا' نشے کا وقت تو یہی ہے۔
پھولوں کی رنگا رنگ بہار ایسے تھی جیسے بیاہ پر آئی ہوئی ہنستی کھیلتی لڑکیاں' بیلیں پھولوں کے انبار
نچھاور کر رہی تھیں۔
سرو کے درخت شکرانے میں دوگانہ نوافل پڑھنے کھڑے تھے۔
شاخیں اظہار تشکر کے لئے زمین پر سجدہ ریز تھیں۔
خشک نہریں پھر جاری ہو گئیں اور انہوں نے غموں کی گرد دھو ڈالی۔ سبزے کی زبان تیز ہو گئی اور
وہ حمد بجا لایا۔
میاں محمد بخشؒ وصف نگاری کے استاد ہیں۔ انہوں نے رزم و بزم کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ ایک
منظر بطور نمونہ درج ذیل ہے۔

شیر جواناں دی مُچھ پھڑکے سُن سُن شور دماماں
رن وچ تازی جنبش پائی چَبن سار لگاماں
دھونسے دھونس آوازوں چاڑھی شتری شور مچایا
طرم طنبوراں تے کرنائیں غل جگت وچ پایا
چلی سیف صفا صفائیوں صفن صاف کریندی
چیر لوہے کوہ قافاں تائیں سچی لاف مریندی
چھم چھم وسن تیر خدنگی جیوں رتھ پھاگن والے
چھك کماناں پئی جواناں ھتھیں پُر پُرچھالے
سارا زور نہ مٹھے ھوئے تیر اندازے مریندے
ترکی تازی تازی ترك و تاز کریندے
سورج چھپ گیا وچ دھوڑاں پیا غبار ھنیرا
چمکو چمك ھتھیاراں والی چانن کرے چوپھیرا
تیراں شونك شپاشپ تیغاں سن کڑکاڑ کمانی

دھشت کولوں اُڈ اُڈ ڈھٹھیاں جیوں اِلاں اسمانی

ترجمہ:

''ہتھیاروں اور گھوڑوں کی مناسبت سے ایسے صوتی الفاظ لائے ہیں کہ جنگ کا ہنگامہ آنکھوں کے سامنے ہی نہیں آتا بلکہ اُس کی آوازیں بھی کانوں میں گونج اُٹھتی ہیں۔ پہلے شعر میں کہا ہے کہ دمامے پر چوٹ پڑتے ہی جوشِ وغا سے بہاروں کی مونچھیں پھڑنے لگیں اور عربی گھوڑے حملے کیلئے بیتاب اپنی لگامیں چبانے لگے۔ دھونسے دھونس' شتری شور' طرم طنبور کے الفاظ میں آواز کی مناسبت ہے۔ تلواروں کے چلنے کی آوازیں صفا صفائیوں' صفن صاف اور شپاشپ کے الفاظ میں سُنائی دیتی ہیں۔ چمکو چمک ہتھیاراں والی' چانن کرے چو پھیراج کی تکرار نے تاریکی میں روشنی دکھادی ہے۔

شاہپال اور قاسم دیو کی فوجیں میدان میں خیمہ زن ہیں۔ صبح جنگ کا آغاز ہوگا۔ سب جنگ کے ہولناک نتائج سے واقف ہیں۔ اس لئے سب پر خوف و ہراس طاری ہے اور آپس میں اس طرح گفتگو کرتے ہیں۔''

کس نے خبر ہوئے گا بھلکے کیہ اساں سنگ کارا؟
کون اکھیں تھیں اوھلے ھوسی' کس دا میت پیارا؟
کس گھر وین سیاپے ھوسَن کس گھر منگل سوھلے؟
کس سر تاج ٹکے کس منہ نوں کرن مٹی دے اوھلے؟
کس کس اندر پوگ وچھوڑا کون ملے گا مڑ کے؟
کیھڑے کیھڑے یار محمدؐ بھلکے بھسن جُڑ کے؟

ترجمہ:

''کس کو معلوم ہے کہ کل ہم پر کیا گزرے گی' کس کا محبوب آنکھوں سے اوجھل ہوگا۔ کس کے گھر ماتم ہوگا اور کس کے گھر میں خوشی' کس کے سر پر تاج رکھا جائے گا اور کس کو سپردِ خاک کیا جائے گا کون کس سے جدا ہوگا اور کون پھر سے ملے گا اور کون کون دوست کل پھر مل کر بیٹھیں گے۔

میدانِ جنگ کی تصویر ملاحظہ فرمائیں' دونوں فوجیں صف آرا ہیں مگر پھر بھی اُن کے انداز ظاہر کر رہے ہیں کہ وہ لڑنا نہیں چاہتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ جنگ صرف دو بادشاہوں کے ذاتی عناد کے تحت ہوگی۔ اس میں عوام کی کوئی بہتری میں وہ خود لڑنے پر آمادہ نہیں بلکہ لڑنے جارہے ہیں۔''

صفاں قطاراں بنھ کھلوتے ایک دوجے ول تکدے

میر وزیر نہ تیر چلاون وار کرن تھیں جھکدے

(سب صف بہ صف کھڑے ہیں' مگر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں سب سرداراور وزیر وار کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔سب کے دل میں یہ تمنا ہے کہ یہ بلا کسی طرح ٹل جائے تو اچھا ہے......)

مت کوئی ڈھو صُلح دی ڈُھکے اوّل سٹوّں پھٹوّں

وچ میان رھن شمشیراں شیر ھٹن اِس چھٹوّں

(شاید وار کرنے سے پہلے کوئی صلح کی تدبیر نکل آئے اور شمشیریں میان ہی میں رہیں اور جھپٹ سے باز آجائیں۔مگر اس کے باوجود جنگ ہوتی ہے اور مکم ملتے ہی دونوں فوجیں ایک دوسرے پر پل پڑتی ہیں' جنگ کا نقشہ میاں صاحب ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

سر پر چھاں کیتی ھتھیاراں سورج اکھ چھپائی

مچھر نوں پر مارن جوگی تھاں نہ وچ ھوائی

پنبے اوڈے جان تناں دے جیوں تیلی رُوں تنبے

نیزے برچھے جا جا رگڑن انبر اُتّے سُنبے

چھم چھم برسن تیر تفنگاں جیوں رتھ ساون والے

چھک کماناں پلے جواناں ھتھیں پُر پُر چھالے

(ہتھیاروں نے سروں پر سایہ کرلیا۔سورج نے آنکھ چھپالی ہے اور مچھر کو ہوا میں پر ہلانے کی جگہ نہیں ملتی۔جسموں سے گوشت کے ٹکڑے اس طرح کٹ کٹ کر اڑتے ہیں جس طرح تیلی روئی دھنتا ہے نیزوں اور برچھیوں کی انیاں آسمان سے ٹکراتی ہیں۔تیر ساون کی بارش کی طرح برستے ہیں۔کمانیں کھینچ کھینچ کر جوانوں کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔

میاں محمد صاحب نے جنگ کی تصویر کشی اس انداز میں کی ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔قصہ بھی بہت طویل ہے مگر انوکھی تشبیہات اور زورِ بیان کا یہ عالم ہے کہ قاری کا ذہن ہر شعر پر چونک اٹھتا ہے۔

الغرض سیف الملوک ایک عظیم ترین تصنیف ہے جس میں زندگی کے تمام پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔چونکہ یہ کتاب عوامی زبان میں ہے اس لئے عوام کے بہت قریب ہے۔

اس کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں گروہ کے لوگوں کی تسکین کا سامان ملتا ہے۔سیف الملوک کی زبان نہ خالص وسطی پنجابی ہے نہ ٹھیٹ پوٹھوہاری۔بلکہ علاقہ پوٹھوہار میں جتنی بولیاں بولی جاتی ہیں۔سب کا مرکب ہے۔فارسی کے الفاظ بھی کثرت سے

استعمال کئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ قصہ اپنے شیدائیوں کے لئے ذرا مشکل ہوگیا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا اور اس کے روحانی اور حقانی اشعار قدم قدم پر نوع انسانی کی رہنمائی کرتے ہیں۔

میاں محمد بخشؒ ایک پنجابی غزل گو

پنجابی غزل کا پہلا شاعر شاہ مراد خانپوری (وفات ۱۷۰۲ء) کو تسلیم کیا گیا ہے۔ میاں محمد بخشؒ شاہ مراد خانپوری کی وفات کے ۱۲۸ سال بعد ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ شاہ مراد اور میاں محمد کے درمیانی ۱۲۸ سال کے عرصہ میں پنجابی غزل کے بارے میں پنجابی شعر و ادب کی تاریخ اندھیرے میں ہیں۔ یعنی اس عرصے میں کسی شاعر کی کوئی پنجابی غزل سامنے نہیں آتی۔ اسی لئے میاں محمد کو ہم پنجابی غزل کا دوسرا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔

پنجابی غزل کی بنیاد اگرچہ سید حامد شاہ عباسی نے اپنے جنگ نامہ میں استوار کی تھی۔ لیکن میاں محمد نے پنجابی غزل کو اس کمال تک پہنچایا کہ ہم اسے پورے فخر کے ساتھ اردو اور فارسی غزل کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں۔ حافظ شیرازی کی جہاں فارسی غزلیں فارسی ادب کی مٹھاس اور محبت کا گہرا اثر لئے ہوئے ہیں وہاں میاں محمد کی پنجابی غزل میں پنجابی مزاج کا وہ رچاؤ اور درد و سوز ہے کہ پتھر دل بھی موم کی طرح پگھل جاتے ہیں۔

سیف الملوک میں میاں محمد بخشؒ کی آٹھ دس غزلیں اور چند دوہے بھی ہیں۔ اس صنف میں بھی ان کی قادرالکلامی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ میاں صاحب غزل کی زبان اور اس کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کی غزلوں کی زبان بڑی میٹھی اور پر تاثیر ہے۔ الفاظ تراکیب نہایت سادہ اور مناسب ہیں۔ تشبیہات مقامی اور زود فہم اور استعارے بڑے دلکش و سادہ ہیں۔ جن سے غزل کے خدوخال بڑے تیکھے اور گہرے ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کی غزلوں میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے لیکن بایں ہمہ ان کی غزلوں میں ایجاز و اختصار اور رمز و ایما کی بہتات ہے۔ اُنہوں نے اپنی ان غزلوں میں صنعت کا بھی استعمال کیا ہے مگر صنعتوں کے استعمال میں انہوں نے کسی طرح کے تصنع یا بناوٹ سے کام نہیں لیا بلکہ ان میں بھی ایک گونہ بیساختگی پائی جاتی ہے۔

نمونہ غزل

کِیہ کجھ گل سجن دِل بیٹھی چت میرے تھیں چایا

کیہ گستاخی نظریں آئی تختوں سٹ رُلایا

ترجمہ:

''معلوم نہیں کہ میرے محبوب کے دِل میں کونسی بات بیٹھ گئی ہے کہ اس نے اپنا دل میری طرف سے ہٹالیا ہے۔ نجانے اسے مجھ میں کونسی گستاخی نظر آ گئی ہے کہ اس نے مجھے تخت سے گرا کر خاک میں رُلا ڈالا ہے۔''

حدوں بہت جدائی گذری یار نہ مکھ وکھایا
ربّا میرا یار ملن دا وقت نہیں کیوں آیا؟

ترجمہ:

''جدائی حد سے زیادہ گزر چکی ہے اور میرے محبوب نے مجھے اپنا چہرہ نہیں دِکھایا۔ اے خدا! ابھی تک میرے محبوب کے ملنے کا وقت کیوں نہیں آیا؟''

اگے اُس دے مرن شہادت جے دِسے اِک واری
نہیں تے گلیاں وِچ مراں گا چا ایہو دِل چایا

ترجمہ:

''مجھے تو اس کے آگے ہی مرنے کا شوق شہادت ہے۔ ہاں اگر وہ ایک مرتبہ کہیں نظر آ جائے اور اگر ایسا نہ ہوسکا تو پھر میں گلیوں میں ہی مرجاؤں گا بس یہی ایک شوق مجھے لئے پھرتا ہے۔''

کیہ ہوندا جے دلبر میرا ہس کے مکھ وکھاندا؟
دردی بن کے پچھدا اِک دِن کیہ کجھ حال وھایا

ترجمہ:

''کیا ہو جاتا اگر میرا محبوب مجھے ہنس کر اپنا چہرہ دکھا دیتا اور مجھ سے میرا ہمدرد بن کر یہ پوچھتا کہ تو نے یہ اپنا کیا حال بنا رکھا ہے اور تو نے کس طرح اپنی عمر گزاری ہے؟ تو اس کا کیا بگڑ جاتا؟''

راہ تکیندیاں اکھیں پکیّاں کن پیغام سنیندے
توں فارغ تے میں افسوسیں ہر دِن رین لنگھایا

ترجمہ:

''راستے کو تکتے تکتے میری آنکھیں پک چکی ہیں اور کانوں کا بھی پیغام سننے کیلئے یہی حال ہے۔ تو فارغ ہے اور عیش و عشرت میں محو ہے اور میں حسرت و افسوس میں ہی دِن رات گزار رہا ہوں۔''

رات وھاں تدہ پچھیا ناھیں دردمنداں دا حیلہ
کیکر رات دھاڑ گزارن عشق جنھاں دُکھ رلایا

ترجمہ:

''تو نے رات دن کبھی بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کیا کر رہا ہوں' تیری خاطر کیا کوششیں اور جتن کرنے میں مصروف ہوں؟ اور دردمند کیا کچھ کرتے پھرتے ہیں۔ وہ کس طرح رات دن گزارتے ہیں جن کو عشق نے دکھ لگایا ہوتا ہے۔''

جے کوئی سوھنی ہور زمیں تے نہ میں حب کسے دی
قبلہ جان میری دا توھیں تدہ وَل سیس نوایا

ترجمہ:

''اگر کوئی اس زمین پر اور خوبصورت اور حسین و جمیل عورت ہو گی بھی تو مجھے کسی اور سے بالکل محبت نہیں ہے۔ تو ہی میری جان کا قبلہ ہے اور تیری جانب ہی میں نے اپنا سر جھکایا ہوا ہے۔''

نہ میں لائق وصل تیرے دے نہیں فراق جھلیندا
ناں اس راھوں مڑاں پچھاھاں نہ تدہ پاس بلایا

ترجمہ:

''نہ تو میں تیرے وصل کے ہی لائق ہوں اور نہ مجھ سے تیری جدائی ہی برداشت ہوتی ہے اور نہ میں اس راستے سے واپسی ہی اختیار کروں گا یعنی پیچھے نہیں ہٹوں گا اور نہ تو نے مجھے اپنے پاس ہی بلایا ہے۔''

دُکھ قضیئے میرے سُن کے ھر اِک دا دِل سڑدا
تدہ نہ لگا سیک محمد میں تن عشق جلایا

ترجمہ:

''میرے درد و غم اور مصائب و مشکلات سُن سُن کر ہر ایک کا دل جلتا ہے۔ لیکن اے محمدؐ! تجھے تو ذرا بھی آنچ نہیں آئی کبھی تجھے اس کی گرمی تک نہیں پہنچی اور میرا سارا تن بدن تیرے عشق نے جلا ڈالا ہے۔''

دوسری زبانوں سے استفادہ

میاں محمد بخشؒ کو دوسری زبانوں سے استفادے کا زیادہ موقع ملا۔ ان کے زیر مطالعہ زیادہ تر مسلمان مصنفوں کی کتابیں رہیں' اس لئے وہ ان ہی سے زیادہ متاثر ہوئے۔ بعض مقامات پر انہوں نے اپنے ماخذوں کا ذکر کیا ہے۔ اور کئی جگہ ذکر کئے بغیر آزادانہ ترجمہ کر گئے ہیں۔ عموماً ان کا ترجمہ جاندار ہوتا

ہے۔ یہاں ''سیف الملوک'' سے اس کے کچھ شواہد پیش کئے جاتے ہیں۔
ایک مشہور شعر ہے جو نعت رسالت مآب سے متعلق ہے۔

هـــزار بـــار بشـــویـــم دهـــن ز عــطـــر گـلاب
هـنـــوز نـــام تـــو گـفـتـــن کـمـــال بـے ادبـــی اسـت

میاں صاحب فرماتے ہیں......

جے لکھ واری عطر گلابوں دھویئے نت زباناں
نام انہاں دے لائق ناہیں کی قلمے دا کاناں

ایک اور مشہور شعر ہے......

آناں که خاك را به نظر کیمیا کنند   آیا بود که گوشهٔ چشمے بما کنند

رومی کا شعر بھی غالباً اسی مفہوم کا حامل ہے۔

کفر گیرو کاملے ملت شود دیں   بگیرد ناقصے علت شود دیں

میاں صاحب کا ارشاد ہے......

مرد ملے تاں درد نه چھوڑے اوگن دے گُن کردا
کامل لوك محمّد بخشا لعل بنان پتھر دا

سعدیؒ......

شنیدم که درد روزِ امید و بیم   بداں رابه نیکاں به بخشد کریم

میاں محمدؒ......

سنیاں میں جد حشر وھاڑے نیکاں لیکھا پڑھ سی
بریاں نوں رب نیکاں پچھے بخش جنت وِچ کھڑسی

سعدی فرماتے ہیں......

چنانِ پهن خوان کرم گسترد   که سی مرغ در قاف روزی خورد

میاں محمدؒ کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے

مان کریندیاں مان تروڑے مسکیناں دا ساتھی
کوه قافاں وچ روزی دیندا سی مرغاں نوں ھاتھی

سعدی حمد باری کرتے ہوئے لکھتے ہیں......

دریـــں ورطـــه کشتـــی فـــرد شـد هـــزار
کـــه پیـدا نـــه شـد تـختـــه بـــرکـنـــار

میاں محمدؒ ترجمانی کا حق یوں ادا کرتے ہیں......

صفت اُھدی نوں فہم نہ پہتا' ذاتی راہ نہ پاندے
اس ڈھابے کئی بیڑے ڈبے' تختہ ہویا نہ باندے
اس خونی دریائوں ڈردے' عقل فہم دے سائیں
کس دی بیڑی باہر آئی' پہنچ اجیہی تھائیں

سعدیؒ تصوف کا ایک باریک نکتہ بتاتے ہیں......

ایں مدعیان ور طلبش بے خبر اند کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

میاں محمد کی زبان سے وہی نکتہ سنیئے......

اس مجلس دا محرم ہو کے پھیر نہ مڑدا کوئی
جو اوہ مست پیالہ پیندا ہوش گواندا سوئی

سعدیؒ اعتراف عجز کرتے ہیں......

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن کہ جاھا سپر باید انداختن

میاںؒ محمد بھی ان کی پیروی میں تسلیم کرتے ہیں......

اس میدان نہ چلّے گھوڑا شینہ حیرت داگجّے
خاص پھلے لا اُحصیی کھہ کے اس دوڑوں سن رجّے

سعدیؒ......

جو بیتے پسند آیدت از ہزار بمردے کہ دست از تعنت بدار

میاںؒ محمد اس پر ترقی کرتے ہیں......

سجناں وچ قلیل بھی جے کر ویکھو سخن اوّلا!
خلق محمدی کرکے کجّو! گھت شرم دا پلّا!
سینکڑیاں تھیں جے ھك آوے بیت پسند تساں نوں
اس ھك چنگے پچھے بخشو! سارے عیب اساں نوں

جامیؒ......

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

میاںؒ محمد......

عشق نہیں اك ویکھن اُتّے سُنیاں بھی اُٹھ وگ دا

منتر اس دا چھرّے وانگوں جا کلیجے لگ دا

دوسرا مصرعہ ملا جامی پر اضافہ کر رہا ہے......

حافظ......

شب تاریک وبیم موج و گردا بے چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ھا

میاں محمد......

رات اندھیری خوف چوفیری بولن دیو بلائیں
عاشق باجھ نہ قدر کسے دا پہنچے ایسے جائیں

رومی......

آں طرف کہ عشق می افزود درد بو حنیفہؒ شافعیؒ درسے نہ کرد

میاں محمد......

منہ نکا تے گل وڈیری نہ کر مت کوئی ھسّے
اعظمؒ شافعیؒ مالکؒ حنبلؒ اِہ مسلے نہیں دسّے

خسرو......

ھمہ آھوانِ صحرا سر خود نھادہ برکف
باامیدآں کہ روزے بشکار خواھی آمد

میاں محمد......

بنھ ہتھیارا سوار ہووے جاں چڑھ دا طرف شکارے
گولی کھا بندے دی ڈھیندے مرگ جنگل دے سارے

حافظ......

دست از طلب ندارم تاکام من برآید
یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن برآید

میاں محمد......

طلب تیری تھیں مڑساں ناھیں جب لگ مطلب ھوندا
یا تن نال تساڈے مل سی یا روح ٹر سی روندا

جامی......

بزم وصلت جائے پاکان است ومن زیشاں نیم

جامی......

دیدنت دشوار و نادیدن ازاں دشوار تر

میاں محمد......

نہ میں لائق وصل تیرے دے نہیں فراق جھلیندا
نہ اس راھوں مڑاں پچھاھاں ناں تد پاس بلایا

غزل سے لیا گیا شعر......

حافظ......

جزیں قدر نتواں گفت در جمال تو عیب
کہ خال مہر و وفا نیست روئے زیبارا

میاں صاحب......

حسن جمال کمال تیرے وِچ ہور تمامی صفتاں
ھکو عیب' وفا محبت نہیں اندر زیبائی
بلبلے برگِ گُل خوش رنگ در منقار رداشت
وانداں برگ و نوا خوش نالھائے زار داشت
گفتمش درعین وصل ایں گریہ و فریاد چیست
گفت مارا جلوہِ معشوق در ایں کار داشت

میاں محمد اس کی شرح فرماتے ہیں......

جیوں کر خواجہ حافظ صاحب کھیا وِچ دیوانے
اک بلبل میں روندی ڈٹھی پھڑیا پھل دھانے
میں پچھیا کیوں روویں بی بی یار تیرا رل ملیا
درد فراق رھیا پھر کیکر جس سجن گل ملیا
بلبل بولی' حافظ صاحب کیہ گل پچھیں مینوں
اس روون دی حال حقیقت ھے کجھ معلم تینوں
محبوباں دے جلوے اگے اساں غلامی چائی

روون پٹن کار ھمیشہ اس سانوں فرمائی
جنہاں دے دل عشق سماناں روون کم انہاں ہاں
وچھڑے روندے ملدے روندے روندے ٹردے را ھاں

مناسب ہے کہ یہاں آیاتِ قرآنی کے ترجمہ و تلمیح کا نمونہ بھی پیش کر دیا جائے۔ میاں محمد فرماتے ہیں......

کس مذھب وچ جائز آیا بھجن قول قراروں
"اوفو بعھدی" حکم نوں پڑھیئے مکھ نہ موڑیں یاروں

سورہ بقرہ رکوع ۵ میں بنی اسرائیل سے خطاب کے سلسلہ میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں......''اوفوا بعھدی اوف بعھدکم وایای فارھبون'' تم میرا اقرار پورا کرو تو میں تمہارا اقرار پورا کروں' اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو......

ایک مقام پر شہزادہ دعا کرتا ہے' دعا قبول ہوتی ہے۔ میاں صاحب فرماتے ہیں......

پئی دعا قبول حضوروں رحم ہویا سرکاری
عُسروں یسُر کرن تے آیا چلی مصیبت بھاری

سورہ انشراح کی طرف اشارہ ہے۔ جہاں اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاکؐ کو تسلی فرماتے ہیں......''ان مع العسر یسرہ انّ مع العسر یسرا'' یقیناً مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

ایک موقع پر صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہیں۔

کنڈے ویکھ گلاباں والے دوروں ویکھ نہ ڈریئے
بھاویں کنڈے چبھ چبھ جاون جھولی اندر بھریئے

یہ مضمون آیت ''تواصوابا الصبر'' کی تعمیل معلوم ہوتی ہے۔ یعنی آپس میں ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہو......ایک اور مقام ملاحظہ فرمائیے......

ڈردا خوشی نھیں دل کردا مت رب غیرت جاوے
اگے سدھ رھی ھو گزری ھور مصیبت پاوے

یہ مضمون بھی بعض آیات سے ماخوذ ہے......انّ اللہ لا یحب الفرحین اللہ تعالیٰ اترانے والوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ لاتفرحوابما آ متا کم اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اس پر شیخی نہ کرو......

حمد کے ضمن میں لکھتے ہیں......

صمٌ بکمٌ رھن فرشتے کس طاقت دم مارے

در اس دے پر عـاجـز ھـو کـے ڈھینڈے بزرگ سـارے

''صمٌ وبکمٌ'' آیت کے الفاظ ہیں جو شعر میں عموماً عجز و درماندگی کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں۔

زمین میں پہاڑوں کے وجود کی حکمت بیان کرتے ہیں......

دھـــرتـــی پـــونـــڈ ڈولانـــدی آھـــی

ایــــدھــــــر اودھــــــر ھـــــو کـــــے

حـکـمــت نـــال لـگـــا یـوس مـحـکـم

کـــوہ قـــــافـــــاں دے کـــو کـــے

یعنی زمین میں پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا ہے تا کہ وہ اپنی گردش و حرکت میں غیر متوازن نہ ہو سکے۔ یہ مضمون ذیل کی آیات سے لیا گیا ہے۔ والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم......زمین میں پہاڑ ڈال دیئے کہ تم کو لے کر ایک طرف کو نہ جھک پڑے۔ الم نجعل الارض مہاداً والجبال اوتاداً......کیا ہم نے زمین کو بچھونا اور پہاڑوں کو میخیں نہیں بنایا؟

ناقدین کی آرا

1. Mohammad Bakhsh was another critic of his time. He gave thoughtful critical appreciation from Sheikh Farid upto his centemporary writers. As an author he wrote one big composition "Saif-al-Maluk" in his kissa we find the sense of super naturalism like that of S.T. Coleridge in Ancient Mariner, and Kublai Khan, Saiful Maluk can be considered the blend of beauty, chivarly, adventure and super naturalism all these above mentioned traits glorifies the spirit of romanticism in the medieval age of Maharaja Ranjit Singh.

(History of Punjabi Literature- Dr. C.L.Narang; National Book Shop- Delhi 1987, Page 183)

2. Mohammed Bakhsh has earned a name for his kissa entiled "Saiful Maluk", which is again a story from West Asia. It is a voluminous work of one thousand nine hundred and twenty eight long stanzas. A mixture of Arabic- Persian words and description of the beauty of rural women are its main characteristics.

(A History of Punjabi Literature by Sant Singh Sekhon and Kartar Singh Duggal- Sahitya Akademi Delhi, 1992

Page 90)

Mian Mohammad knew prosody well. He himself was conscious of the high quality of his verses, and complained of nonappreciation by the people. From his verses it appears that Mian Mohammad was a wellinformed man. We find many references in his verses to the current branches of knowledge. He gives vivid details of the then prevalent dresses, occupations, musical instruments, games and sports, tricks of wrestling, birds, raags and raagnies, species of horses. He names many Punjabi poets otherwise unknown and praises them as masters of their art. The real poetic art of Mian Mohammad lies in attractive similies and metaphors, and in rich vivid imagery, depicting human and natural beauty, scenes, personalities, royal splendour, merry-making, assemblies, decorations, giants, garden scenes, beasts and battle scenes etc.

Punjab- Syed Abdul Quddus- Royal Book Co, Karachi, 1992, Page 174-175.

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند

پنجاب کی رومانی داستانوں میں سیف الملوک اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتی ہے کہ یہ خالصتاً تصوف کی اصطلاح میں بیان ہوئی ہے...... حقیقت پسندانہ انداز بیان، تصوف کے اسرار و رموز کرداروں کے جذبہ ایثار و قربانی اور رواں اسلوب نے اس داستان کو بہت مقبولیت بخشی ہے۔

(تیرھویں جلد، علاقائی ادبیات مغربی پاکستان حصہ اول۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ ص ۳۷۷۔۳۷۳)

پروفیسر غلام حسین اظہر

انہوں نے محض داستان کے واقعات کو رقم نہیں کیا بلکہ اپنے خون جگر کی آمیزش سے اسے ذاتی تجربات و مشاہدات وصوفیانہ رموز و معارف کا آئینہ بنا دیا ہے......میاں صاحب نے سوز و گداز اور معرفت کے رموز کو اس قصے میں سمونے کے ساتھ ساتھ اس کی دلچسپی اور شیرینی کا بھی بطور خاص خیال رکھا ہے۔ انہوں نے مجاز کے پردے میں گہرے صوفیانہ حقائق کو بیان کیا ہے۔ تاکہ خواص اور عوام دونوں ہی اس کتاب سے لطف اندوز ہوں۔

ان کا فکری سطح پر سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ہی قصے میں ایک نامیابی کل کی صورت میں ان تمام نکات کو پیش کیا ہے۔ جنہیں فارسی اور پنجابی صوفیاء مختلف تمثیلوں اور قصوں میں بکھری ہوئی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق الٰہی اور تصوف نے ایک تخلیقی سرگرمی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ان کا انداز بیان خشک' ایک سطحی اور واعظانہ نہیں بلکہ اس میں مجازی حقائق سے بڑھ کر حلاوت موجود ہے۔ ذاتی طور پر صوفیانہ تجربات و مراحل سے گزرنے کی وجہ سے ان کے یہاں تصوف کے بہت سے نازک اور دقیق مسائل روایتی طور نہیں بلکہ ایک سچے تجربے کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے ہیں۔

(میاں محمد...... شخصیت اور فن۔ ص۸۹۔۸۸)

محمد سرور

میاں محمد کی سیف الملوک المیہ ادب کا سب سے بلند شاہکار ہے۔

(پنجابی ادب ص۱۰۸)

ڈاکٹر لئیق بابری

سیف الملوک حسن کی تلاش میں انسان کا سفر ہے......میاں محمد نے اپنے اشعار کے ذریعے آسمانی نور کو اس کائنات میں بکھیرا اور ان کا شعری عمل سخاوت کا عمل ہے۔ ایسے سخی کا جو مٹھیاں بھر بھر کھرے اور سچے الفاظ لٹا رہا ہے......میاں محمد شعر کہنے سے پہلے ایک بڑے فنی نقاد ہیں۔ ان کے نزدیک فنی تخلیق کی بنیادیں شاعر کے ذاتی تجربے پر قائم کی جاتی ہیں اور شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اپنے آنسوؤں کو یوں یک جان کر دے کہ جیسے ساری کائنات کے دکھوں میں وہ برابر کا شریک ہے او ردکھی ماں یا باپ' بیٹی یا بیٹا بہن یا بھائی سب کو اپنے آنسوؤں کی تصویر دکھائی دے۔ یہ کام وہی شاعر کر سکتا

ہے جس نے خود آنسوؤں کے دریا پار کئے ہوں۔

(سخن کے وارث۔ص۸۳۔۸۴۔۸۵)

کرم حیدری

موضوع سے قطع نظر فن کے اعتبار سے بھی یہ نظم ایک عظیم کارنامہ ہے۔اس میں انداز بیان کی نزاکت، تشابیہ اور استعارات کی ندرت، محاکاتی حسن، جوشِ کلام، علو تخیل الغرض وہ تمام شعری محاسن موجود ہیں جو ایک اعلیٰ پائے کی نظم میں ہونے چاہئیں۔

(پوٹھوہاری گیت۔ص۳۲)

مولوی محمد کرم الدین دبیر (بھیں)

لکھا سیف الملوک افسانۂ عشق
جو ہر اک شخص کے نوکِ زباں ہے
معارف کا خزینہ ہے وہ گویا
کہ ہر مصرع میں رمزِ صد نہاں ہے

(قصیدہ تقریظیہ برائے ہدایت المسلمین)

سرور مجاز

سیف الملوک کے اس عظیم خالق نے انسانی معاشرے کے پیچیدہ مسائل کو بڑی آسانی سے پیش کیا ہے اور بڑی پرکاری اور سادگی سے انسان کی داخلی زندگی کے قرب و جوار میں فطری حوالوں سے ان کا سادہ اور آسان حل تلاش کیا ہے۔ان کی فکر کی جڑیں اپنی ہی دھرتی میں ہیں اور اس کی صداقت کے لئے انہوں نے جن مشاہدوں اور تجربوں کے حوالے دیئے ہیں وہ بھی داخلی ہیں۔میرے نزدیک میاں صاحب اس مادی دور میں جس میں انسان اپنے عیب چھپانے کے لئے حیلہ سازیوں میں معروف ہے۔ مسلمہ فطری ضابطوں اور اصولوں سے حقیقت کو منواتے ہیں......
میاں محمد انسان کو باہر سے جگانے کے قائل نہیں وہ جسم کے دروازے پر دستک نہیں دیتے بلکہ اندر کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں۔ظاہری یا سطحی بیداری مادیت کے فریب میں الجھا کر انسانوں کو تشدد اور تخریب پر اکساتی ہے ایک دوسرے کو نفرت پر آمادہ کرتی ہے جبکہ داخلی بیداری کی دستک متانت، سنجیدگی اور معاملہ فہمی کے ادراک اور شعور سے زندہ رہنے کے اصولوں سے آراستہ کرتی ہے۔اس طرح میاں محمد

ایک صحت مند انسانی معاشرہ کے قیام کی نیو رکھتے نظر آتے ہیں۔

(سدا نہ محبت یاراں۔ص۱۴۔۱۳)

شفیع عقیل

اس کتاب میں انہوں نے صرف ایک عشقیہ داستان ہی قلمبند نہیں کی بلکہ جگہ جگہ اپنے عقیدوں اور خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔اس میں زمانے کی ناقدری کا گلہ بھی ہے۔فن کی سچائی کا اظہار بھی ہے اور انسانی دکھ درد کا احساس بھی ہے۔وہ اپنی اس کتاب میں درویش بھی نظر آتے ہیں۔ایک بلند پایہ شاعر بھی دکھائی دیتے ہیں۔اور انسانی سچائیوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔زبان و بیان کی خوبیاں' شاعرانہ صناعی' تشبیہات واستعارات رمز و کنایہ سلاست و روانی' زور بیان اور مشاہدہ' احساس و ادراک' فنی خوبیاں اور سچائیاں' مجاز و حقیقت غرض اپنی اس کتاب میں میاں محمد بخشؒ کی شخصیت جس طرح مکمل صورت میں ابھرتی ہے وہ ان کی اور کسی تصنیف میں سامنے نہیں آتی۔ (۸۱۔۲۸۰)

......کتاب کا بغور مطالعہ کرنے سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ میاں محمد بخشؒ مجاز کے پردے میں جس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ ان کی اپنی زندگی ہے۔یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی اپنی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہے۔جس نے انہیں یہ عشقیہ داستان نظم کرنے پر مجبور کر دیا' چنانچہ میاں محمد بھی سیف الملوک میں جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں ان کی اپنی زندگی چھپی ہوئی ہے۔وہ سیف الملوک اور بدیع الجمال کی کہانی بیان کرتے کرتے اکثر جگہ بھٹک سے جاتے ہیں اور اپنے اس دکھ کو کریدنے لگتے ہیں۔جو ان کے سینے میں چھپا ہوا ہے۔یا جو ان کے احساس میں رچا بسا ہوا ہے۔

......میاں محمد بخشؒ کے ہاں انسانی دکھوں کا بڑا گہرا احساس اور شعور ہے اور ایسے ایک انسان نظر آتے ہیں جو اپنے غم بھول کر دوسروں کے دکھوں میں برابر کا شریک ہو اور یہ انسان دوستی ان کی شاعری کا اہم حصہ ہے۔

(پنجابی کے پانچ قدیم شاعر۔ص۲۰۴۔۱۔۲۸۰'۲۸۶)

سید ضمیر جعفری

مثنوی میں اگرچہ ایک آدم زاد شہزادے (سیف الملوک) اور ایک خالص پری پیکر (بدیع الجمال) کی داستانِ محبت بیان کی گئی ہے۔جس میں انسانوں اور دیوؤں کے درمیان محاربے بھی برپا ہوئے ہیں' مگر صاحب دل' فقرا اور طریقت کے عارف کا اصل منشا اس حوالے سے مشاہداتِ نظری اور وارداتِ قلبی

کا اظہار تھا۔ اِن کا مقصود ظاہراً افزائش جمال اور باطنی پردہ کشائی ہے۔ ان کا موضوع' زندگی کی نقش گری اور آ گہی ہے۔ چنانچہ ان کو جہاں موقع ملتا ہے وہ شہزادے' شہزادے کو راستے میں چھوڑ کر' تصوف وطریقت کے سمندر میں اتر جاتے ہیں۔ چاہت' اضطراب تزکیۂ قلب و ذہن' ابدی سچائیوں کے ادراک و اظہار' اختیار و ضبط نفس کے معارف نے اس شعری تخلیق کو ایک لازوال منشور حکمت بنا دیا ہے۔

(من میلہ ۔۱۸۔۱۷)

عبدالغفور قریشی

سیف الملوک پنجابی وِچ ایسہ ادب دا اک بہت اچا شاہکار اے۔

(پنجابی زبان دا ادب تہ تاریخ ص ۳۴۸...... پنجابی ادب دی کہانی: ۳۷۳)

میاں مولا بخش کشتہ

شعراں وچ روانی تے پکیائی' خیال اُساری' اڈاری' مٹھاس تے لوچ بڑی اے۔ قصہ سیف الملوک خاص کر معرفت دا اک خزانہ اے۔ تشبیہاں' استعاریاں دی جڑت دی بڑی ڈھکویں تے من کھچویں اے۔ تے ایہہ قصہ ایہناں دا ای نہیں سگوں پنجابی بولی دا اک شاہکار اے)۔

(پنجابی شاعراں دا تذکرہ ۔ ص ۱۹۸)

شریف کنجاہی

میاں صاحب نے لکھن نوں بتھیرا کج لکھیا اے پر جس کتاب اونہاں نوں شاعراں وچ تے شاعری دی سرت رکھن والیاں وچ آدر والا بنایا اے۔ اوہ سیف الملوک اے...... دکھاں دا ذکر جتھے وی آوندا اے میاں صاحب دا بیان زور دا ہو جاندا اے تے سدھا دل وچ اُتر جان والا۔ کیوں جے اوہ اونہاں دے دل دی بھڑاس ہوندی دے۔

(جھاتیاں ۱۱۴۔۱۱۲)

کتابیات

A History of Punjabi Literature by Sant Singh Sekhon & Kartar Singh Duggal- Sahitya Akademi, Delhi- 1992.

Punjab- Syed Abdul Quddus- Royal Book Co, Karachi, 1992, Page 174-175.

(History of Punjabi Literature- Dr. C.L.Narang; National Book Shop- Delhi 1987, Page 183)

عارف کھڑی۔صاحبزادہ محمد سکندر کھڑی شریف ۱۹۷۰ء

میاں محمد (شخصیت اور فن) ڈاکٹر غلام حسین اظہر کتب مینار لاہور ۱۹۸۰ء

میاں محمد بخشؒ (حیاتی تے شاعری) اختر امان جعفری سید۔ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی (پنجابی) پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۲ء

میاں محمد بخشؒ عزیز احمد چوہدری پنجاب ریسرچ فاؤنڈیشن کھاریاں ضلع گجرات ۱۹۸۶ء

میاں محمد بخشؒ حمید اللہ شاہ ہاشمی چوہان بک ڈپو۔اردو بازار لاہور۔۱۹۹۰ء

میاں محمد بخشؒ (ایک آفاقی شاعر) ابوالمسعود محمد خلیل ثاقب چوہدری برادرز دینہ، ضلع جہلم ۱۹۹۸ء

پنجابی ادب محمد سرور مطبوعات پاکستان کراچی

پنجابی کے پانچ قدیم شاعر شفیع عقیل انجمن ترقی اردو۔کراچی۔۱۹۷۰ء

پنجابی ادب دی کہانی عبدالغفور قریشی عزیز بک ڈپو لاہور ۱۹۸۸ء

پنجابی زبان و ادب حمید اللہ شاہ ہاشمی انجمن ترقی اردو کراچی۔۱۹۸۸ء

نوادرات عرشی ڈاکٹر تصدق حسین راجا فیروز سنز لاہور ۱۹۹۱ء

سیف الملوک میاں محمد بخشؒ حاجی چراغ الدین سراج الدین لاہور ۱۹۰۸ء

مرزا صاحباں میاں محمد بخش صاحبزادہ میاں محمد زمان، کھڑی شریف ۱۹۷۲ء

شیریں فرہاد میاں محمد بخشؒ صاحبزادہ میاں محمد سکندر، کھڑی شریف ۱۹۷۸ء

تحفہ رسولیہ میاں محمد بخشؒ مطبع نور، لاہور ۱۲۸۸ھ

تحفہ میراں میاں محمد بخشؒ ملک غلام نور اینڈ سنز، جہلم

مثنوی نیرنگ عشق میاں محمد بخشؒ ملک غلام نور اینڈ سنز، جہلم (س ن)

سوہنی مہینوال میاں محمد بخشؒ ملک غلام نور اینڈ سنز، جہلم (س ن)

ہدایت المسلمین میاں محمد بخشؒ چوہدری برادرز، جی ٹی روڈ، دینہ (جہلم) ۲۰۰۴ء

پنج گنج میاں محمد بخشؒ چوہدری برادرز، جی ٹی روڈ، دینہ (جہلم) (س ن)

قصہ شاہ منصور میاں محمد بخشؒ چوہدری برادرز، جی ٹی روڈ، دینہ (جہلم) ۲۰۰۱ء

بوستان قلندری (ترجمہ تذکرہ مقیمی) جہلم ۱۹۳۰ء

شیخ صنعان مع چٹھی ہیر رانجھا از میاں محمد بخشؒ۔ نظامت اوقاف مظفر آباد (س ن)

سخی خواص خاں۔ میاں محمد بخشؒ۔ ملک غلام نور اینڈ سنز، جہلم (س ن)

ترجمہ سیف الملوک ۔ میاں ظفر مقبول۔ مکتبہ دانیال، لاہور (س ن)

تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند (تیرھویں جلد) پنجاب یونیورسٹی، لاہور

قصہ سیف الملوک، میاں محمد بخشؒ۔ ڈاکٹر پیار سنگھ۔ بھاشا وبھاگ پٹیالہ۔ ۱۹۷۲ء تیجا ایڈیشن

مہینہ وار۔ وارث شاہ، ملتان۔ میاں محمد نمبر۔ اپریل مئی ۱۹۷۷ء

ماہنامہ فنون لاہور۔ نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء۔ میاں محمد بخشؒ کے اسالیب بیان۔
سید عباس علی جلالپوری

ماہنامہ فنون لاہور۔ اپریل مئی ۱۹۷۶ء۔ قصہ سیف الملوک۔ شریف کنجاہی

امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا، کشمیر (انگریزی میں) کلکتہ ۱۹۰۹ء

گرمکھی (پنجابی)